جلد ۱۰۴ فروری ۱۹۸۶ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

استفسارات

از: **سید ابوالاعلیٰ مودودی**

ترتیب تدوین: **اختر حجازی**

- ○ مولانا مرحوم فہم دین کے فن کے شناور تھے ان کی مجلس سے کوئی تشنہ نہ اٹھتا تھا۔
- ○ مولانا مرحوم سینکڑوں مجالس میں ہزاروں سوالات کے جوابات دیتے اور کوئی محروم نہ رہتا تھا۔
- ○ مولانا کے ہزاروں معتقدین تھے جو طلب دین کیلئے ان سے رجوع کرتے تھے اور کوئی مایوس نہ لوٹتا تھا۔
- ○ یہ خصوصیت مولانا مودودیؒ کو خداداد صلاحیت کے طور پر حاصل تھی۔
- ○ لوگوں نے ہزاروں سوالات کیے مولانا مودودیؒ نے ہزاروں جوابات دیے

مولانا اختر حجازی صاحب کی ہمت و محنت ہے کہ انھوں نے ان سوالات کو مع جوابات حاصل کر کے ایک ایسا مجموعہ مرتب کر دیا جو تشنگانِ علم کیلئے سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

- ○ ایک کتاب سے عالم کتاب بن جانے کا نسخہ حاضر خدمت ہے۔

سائز: ۱۸×۲۳ • صفحات: ۴۴۸ • قیمت -/۴۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار ○ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۴ | فروری ۱۹۸۶ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اختلافات ونزاعات کے بہت سے ہنگامے میں نے زندگی میں دیکھے — خاندانوں میں، کاروباری حلقوں میں، اخباروں میں، شعرا اور ادیبوں میں، سیاسی اکابر اور ان کے گروہوں میں اور تا بحدِ آخر مذہبی جماعتوں اور دینی اداروں میں — نسبتہً قریبی دائرے کے اندر تحریکِ اقامتِ دین کے علمبرداروں اور خادموں میں۔

یہ سارے تجربات جہاں بے حد رنجدہ ہوتے ہیں وہاں یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ ذوقِ اختلاف کی گندھاوٹ عین انسانی فطرت میں ہے۔ بقولِ ذوق اختلافات ہی سے ساری رونق قائم ہے — شکلوں، صورتوں میں اختلاف، زبانوں اور اطوار میں اختلاف۔ لباسوں اور رہن سہن میں اختلاف۔ سیاست اور معیشت میں اختلاف۔ نظریات اور فلسفے بہت، نظام ہائے اجتماعی کے ڈھانچے مختلف، ایک جمہوریت ہی کے روپ کئی کئی، آمریت کے بھی بہروپ صدہا۔ اور تو اور شریعت میں ایک ہی نص کی مختلف تفسیریں، ایک ہی حکم کی مختلف تعبیریں، حتیٰ کہ چار فقہوں کی موجودگی برحق اور ایک گروہ کہتا ہے کہ پانچویں فقہ کو بھی مانا جائے۔

اختلاف کی کچھ حدیں ہیں جن تک وہ محدود رہے تو اختلافات سے خیر و خوبی پیدا ہوتی ہے جیسے کہ حضورؐ سے اختلافُ اُمّتی رحمۃٌ کا ارشاد منقول ہے۔ مگر حدودِ مناسب سے جب اختلاف آگے بڑھتا ہے تو زحمت و فساد کا باعث بنتا ہے۔

اصولی طور پر اس کی آخری حدیں وحی سے متعین ہوتی ہیں، جیسے کہ مختلف مقامات پر مصحفِ پاک میں یہ مدعا بار بار بیان ہوا کہ:

مَا اخْتَلَفُوْٓا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (جاثیہ-۱۷)

انہوں نے العلم کے آجانے کے بعد ہی اختلاف کیا ہے، باہمی کشمکش کی بنا پر۔

یعنی اہل ایمان کے ہر اختلاف و کشمکش کو العلم کے سامنے آنے پر ختم ہوجانا چاہیے۔ العلم سے مراد حکم خدا اور رسولؐ بالنص ہے۔ اسی بات کو یوں بھی قرآن نے واضح کیا ہے:

فَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (شوریٰ-۱۰)

پھر جس معاملے میں بھی تم اختلاف کرو، تو اس کا فیصلہ کرنے والا اللہ ہے۔

یہ تو سب سے بڑی اصولی بات ہے، لیکن تفصیلات بہت سی ہیں۔

یقیناً بعض جزئی اختلافات نیک نیتی سے بھی ہوسکتے ہیں، مگر ایسے اختلافات اگر غل و غش سے پاک ہوں تو ان کا حل خدا اور رسولؐ کے فرمودات کی روشنی میں فریقین خوش خلقی اور خوش بیانی سے خود ہی کر لیتے ہیں۔ لیکن بیشتر صورتوں میں اختلافی رجحانات و جذبات میں شیطان نفسانیت کی ملونی ڈال دیتا ہے۔

اختلاف کا معاملہ ایسا ہے کہ قرآن وحدیث میں بڑے جامع انداز سے اسلامی حکمتِ اختلاف یا فلسفۂ اختلاف کو بیان کردیا گیا ہے اور ہر نکتہ کے ساتھ واقعاتی نظائر موجود ہیں۔ گو ان ساری تفصیلی ہدایات کو یہاں جمع کرنا ممکن نہیں، کوشش یہ ہے کہ ان کا ماحصل سامنے لایا جائے۔

اسلامی حکمتِ اختلاف سے استفادہ کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ دینِ برحق جن مقاصد کے لیے آیا ہے اُن کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں کہ توحید کی بنیاد پر مسلمانوں کی مضبوط وحدت (بُنیانِ مرصوص) استوار ہو۔ یہی اشارہ ہے فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانا کا۔ توحید جتنی صحیح طور پر دلوں میں راسخ ہوگی، اہلِ توحید کا اتحاد بھی اتنا ہی مضبوط ہوگا۔

پھر حقیقت کا ایک پہلو یہ سامنے رکھنا چاہیے کہ جس شخص کی نگاہ آخرت پر زیادہ مرتکز ہوگی یا جو کوئی اپنے نصب العین کے عشق میں سرشار ہوگا اُسے چھوٹے چھوٹے قضیوں اور جھمیلوں سے دلچسپی نہ رہے گی اور وہ وقت اور قوتوں کا ضیاع پسند نہ کرے گا۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ اصل اختلاف ایمانیات یا زندگی کے بنیادی تصورات کا اختلاف

ہوتا ہے، بعدازاں اُصول و احکام کی تعبیرات کے اختلافات سامنے آتے ہیں، پھر تدابیر، مصالح اور انتظامی اُمور کے اختلافات اور آخری درجے پر ذاتی مفاد کے اختلافات۔

پہلی قسم کے اختلافات تو اسلام پر ایمان لاتے ہی اہلِ ایمان کے درمیان ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے اختلافات علمی، تحقیقی اور استدلالی ہوتے ہیں جن کا فیصلہ استدلالی طریقوں سے ہونا چاہیے اور جن کو اگر فریقین خود حل نہ کر سکیں تو کوئی ایسا شخص یا ادارہ ڈھونڈا جاتا ہے جو" فوق کل ذی عِلمٍ علیم" کے مطابق علمی لحاظ سے فائق اور بلند تر اور معتمد علیہ ہو۔ تدابیر و مصالح کے اختلافات میں سے بعض بہت زیادہ اہمیت والے ہوتے ہیں اور بعض کم اہمیت والے۔ ان کو حل کرنے میں استدلالی طریق کے علاوہ شورائیت کے اس اُصول کو بھی برتا جاسکتا ہے کہ چند افراد خود یا زیادہ وسیع حلقے کے اجتماعِ تام یا اجماعِ ناقص کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ نہ کریں تو پھر کوئی حل نہیں۔ آگے افتراق ہی افتراق اور فساد ہی فساد ہے۔

سب سے آخری درجہ انفرادی یا گروہی مفاد کی کشمکش سے پیدا ہونے والے اختلافات کا ہے۔ ان کا حل گفتگو اور دلائل سے اگر نہ ہو سکے تو پھر ثالثی یا تحکیم یا عدالتی انداز سے ہو جانا چاہیے اور فریقین جس طریقے کو بھی مانیں اُس کے تحت ہونے والے فیصلے کا دونوں کو پابند ہونا چاہیے ___ خواہ نفع ہو، یا نقصان، اور کسی صورت میں بھی کسی فریق کو بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔

یہ راستے خود شریعت ہی نے ہمیں بتائے ہیں۔ ان کو نہ مانا جائے تو پھر نزاعات کا کوئی حل نہیں ہے۔ اور دل و دماغ میں زہریلے آبلے پڑ جائیں گے اور زندگی آگ کے شعلوں سے بھر جائے گی۔ وہ چہرے جن پر مسکراہٹوں کے پھول کھلنے چاہئیں ان پر نفرت کے تارکول کا غبار چپک جائے گا۔ اس غبار کو اگر دنیا میں نہ صاف کیا جاسکے تو خدانخواستہ آخرت تک بھی ساتھ جاسکتا ہے۔

اُوپر درج شدہ آیت میں لفظ" بغی " کا استعمال ہوا جس کے معانی میں زیادتی، ظلم اور بے جا حصولِ مفاد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بیماری مال یا مادی مفاد ہی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ انانیت، تکاثر و تفاخر، رشک و حسد، شہرت حاصل کرنا، اپنی عزت و ناموری کو بڑھانا اور

دوسرے کا درجہ گھٹانا، قوت و اثر میں کسی دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے غلط سلط ذریعے اختیار کرنا، ان سب مظاہر کے پیچھے وہی بیماریٔ دل کام کرتی ہے۔ اس طرح کے محرکات و عوامل کا محض زہر فکری یا تدبیری اختلافات میں آ ملتا ہے۔ کبھی کبھی کسی کے متعلق کوئی ایسی وجۂ ناپسندیدگی پیدا ہو جاتی ہے یا کبھی ایسی بدگمانیاں جمع ہو جاتی ہیں کہ کسی فرد یا گروہ کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس نفرت کا تلخ و گرم لاوا ہر قسم کے اختلافات کی بحثوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رُو سے کچھ چیزوں سے اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ مثلاً:۔

۱۔ اپنے آپ کو مقامِ کبر (جس کی بنیاد یا مادی فوقیتوں، علمی بالاتری، لسانی و قلمی مہارت یا عہدہ و منصب جیسی چیزوں پر استوار ہوتی ہیں) پر رکھ کر دوسروں کی تحقیر و تضحیک نہ کی جائے۔

۲۔ کسی بھی قسم کی سرسری افواہوں پر جو کسی دوسرے شخص (خصوصاً جس کے متعلق پہلے سے کوئی پھانس موجود ہو) کے بارے میں موصول ہوں، اچھی طرح تحقیق کیے بغیر کوئی رائے قائم نہ کی جائے۔

۳۔ غیبت کا راستہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے بلکہ شخصِ متعلق سے کوئی شکایت یا اس کے بارے میں کوئی اشتباہ ہو تو اخلاقی جرأت سے کام لے کر براہِ راست بات چیت کر لینی چاہیے۔ اپنی غلطی سامنے آجائے تو معافی طلب کر لینی چاہیے اور دوسرے کو غلطی کا احساس ہو جائے تو بلا تامل معاف کر دینا چاہیے۔

اس الجھن کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اگر متعلقہ لوگ شکایات و شبہات سننے پر تیار ہی نہ ہوں اور سنیں تو خوشگواری کے انداز کو برقرار نہ رکھ سکیں، نیز سُن لینے کے بعد مستفسرانہ انداز میں شکایت کرنے والے کو بلیک لسٹ کر کے پھر اس سے انتقام لینے کی چالیں چلنے لگیں تو کیا ہو؟ میری رائے میں یہ حالت کسی اوسط درجہ کے اسلامی معاشرے (خصوصاً اس کے تعلیم و تربیت پائے ہوئے افراد کی کسی تنظیم) میں قابلِ تصور نہیں ہے۔ یہ حالت اگر عملاً پیدا ہو جائے تو پھر اسلامی کردار کی نشوونما کی امیدوں سے ہاتھ دھو لینا چاہیے۔

۴۔ چند افراد کے سلسلۂ غیبت و نجویٰ سے بڑھ کر زیرِ سطح طوفانِ منافرت کہیں زیادہ خطرناک ہے، جو دوب گھاس میں پھیلنے والے پانی کی طرح غیر محسوس طور پر دور دور تک کے ریشوں

کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ انتہائی بدنصیبی ہوگی کسی بھی دینی مقصد کے لیے جمع ہونے والے گروہ کی، جس میں شخصیتوں کی حمایت و مخالفت میں غیبت کھلنے کھل جائیں اور پروپیگنڈا اسٹر قائم ہو جائیں، نیز نشر و اشاعت کی مہارتیں کام کرنے لگیں۔ میں نے بعض اوقات ماہرینِ فنِ نمیمہ کو بے دغدغہ ذہن و زبان کا نہایت افسوسناک استعمال کرتے پایا ہے۔ میں جب عالمِ تصور میں یہ نقشہ دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ آیتیں اور حدیثیں پڑھ پڑھ کر اختلافات و نزاعات کی آگ کو مقدس دامنوں سے ہوا دے رہے ہیں تو غلبۂ الحاد و ظلم کے اس دور کی تباہ کاریوں کا اندازہ کر کے میرے دماغ کا ذرہ ذرہ لرز جاتا ہے۔

۵ — دین کے سرچشمۂ ہدایت میں مسلمانوں کے لیے بہترین اور صحیح رویہ "اصلاح بین الناس" کا ہے۔ جہاں کوئی اختلاف و نزاع موجود ہو، وہاں بجائے اس کے کہ کچھ افراد ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں اور کچھ دوسرے کیمپ میں — اور پھر ایک طرف کی قوت اور دوسری طرف کی قوت رسہ کشی کرنے لگے تو جیت خواہ "الف" کی ہو، خواہ "ب" کی — خدا و رسولؐ کے دین کے لیے جو مہم چل رہی ہے اُسے ضرور نقصان پہنچے گا۔ آس پاس کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ایک طرف والوں کو بھی غلطیوں کا احساس دلائیں اور مخالفت کے لیے تلخی کو کم کرائیں اور دوسری طرف جا کر بھی اصلاح و درستی کا سبق دیں۔ یہ کوئی طریقہ نہیں کہ کوئی سی مسلمان جماعت ایک طرف کا جھنڈا اُٹھا کر دوسری جانب کے لیے صرف کردار کشی کی مہم چلانے میں لگ جائے۔

ضمناً یہ بھی مجھے عرض کرنا ہے کہ افراد اور جتھوں کی جب کبھی بھی کوئی کشمکش ہوتی ہے تو اسے حمایتِ صداقت کے نام پر اُصولی رنگ ضرور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ بیشتر نزاعات میں حقیقت و صداقت کے کچھ اجزا ایک طرف ہوتے ہیں اور کچھ دوسری طرف۔ ایک طرف والے دوسری جانب کی صداقتوں کو زیرِ غور نہیں لاتے اور دوسری جانب والے پہلے فریق کی صداقتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ صداقتوں کے اس طرح تقسیم ہو جانے کی صورت میں کسی طرف کے لیے صد فیصد حمایت یا مخالفت مغالطوں پر مبنی ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے مغالطہ انگیز! نزاعات کی فضا میں مہم صرف صلح و سازگاری کے لیے چلانی چاہیے۔

۶ — "المجالس بالامانۃ" کا اُصول توڑنے سے بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور معاملات سلجھنے کے بجائے اُلجھتے ہیں۔ کوئی بات جس دائرے کے اندر کی تھی اُس سے اُٹھا کر باہر لے جانے کا فریق "الف" سے جتنا سرزد ہو، اس کا وہ ذمہ دار ہے اور فریق "ب" سے جس حد تک صادر ہو اس

کا وہ جواب دہ۔

جن اختلافات کے بیان کرنے کا ایک دائرہ شریعت کی روشنی میں دستور اور روایات کے ذریعے خود ہم نے اپنے لیے مقرر کیا ہے، اس دائرے سے اختلافات کو باہر لے جانا ایک سنگین لغزش ہے۔ ایسی لغزش جس سے بھی سرزد ہو اور جو بھی ایسی غلطی کے کسی ذمہ دار کی حمایت کا علَم اٹھاتا ہے، وہ اپنے کردار کے مطابق آخرت میں تو جواب دہ ہے ہی، اس دنیا میں بھی متعلقہ لوگوں کے سامنے اس کے لیے وضاحت کرنا لازم ہے اور خود لوگوں کو بھی وضاحت طلب کرنی چاہیے ـــ اور اگر کسی کی غلطی واضح یا ثابت ہو تو اس پر انسانوں سے معذرت اور اللہ سے توبہ و استغفار ضروری ہے۔

خاص طور سے اگر ہم میں سے کچھ لوگ صرف ایک طرف اور کچھ دوسری طرف مل کر اور گفتگو کر کے ایک مخصوص نہج سے کیس مرتب کر لیں اور اسے دوسرے فریق کے خلاف لے آئیں تو ان کی طرف سے تو پہلا قدم ہی ناانصافی کا اٹھ گیا۔ اب وہ آگے کیا انصاف کریں گے۔ جسے کسی معاملے میں مصالحت پسندی یا منصفی کے جذبے سے دلچسپی ہو وہ ایک طرف ملاقات کرے تو پھر دوسری طرف بھی کرے، ایک فریق سے کیس معلوم کرے تو دوسرے سے بھی جا کر دریافت کرے۔ اتنی فرصت نہ ہو، یا ذہن میں پہلے سے ذاتی ذوق، قرب و بُعد کا کوئی اثر موجود ہو تو ایسے جھگڑوں کے میدان میں اترنا ہر شخص پر فرضِ عین نہیں ہے۔ کئی اور نیک کام کرنے کے موجود ہیں جو اہم تر ہیں۔

مجھے بعض ناخوشگوار احوال پیش آنے پر یہ ناخوشگوار تجربہ ہوا کہ قرآن و سنت کے منشا کے مطابق غیر جانب دارانہ ذہن کے ساتھ مصالحت پسندی یا منصفی کے جذبے سے کم ہی کوئی شخصیت آگے بڑھتی ہے۔ زیادہ تعداد ایسی نکلتی ہے جس کا سلوگن زبانِ عمل سے یہ ہوتا ہے کہ "اُدھر تم، اِدھر ہم"۔ اس "اُدھر اور اِدھر" سے جو تباہی قومی زندگی میں مچتی ہے اس سے اندازہ کر لیجیے کہ کسی جماعتی یا کاروباری یا خاندانی دائرے میں یہی ذہنیت گھر داخل ہو جائے تو نتائج کیا ہوں گے۔ حضرات! یہ راستہ افتراق اور گروہ بندی کا راستہ ہے۔ سوچ سمجھ کر چلیے، اور سنبھل کر چلیے۔

اس میدان میں محض جانب دارانہ جذبات کے ساتھ آنکھیں بند کر کے غلط طور پر زورِ زبان یا زورِ قلم یا زورِ جتھہ کا استعمال نہ دنیا میں مفید ہے، نہ آخرت میں باعثِ خیر۔

۷ ـــ فریقینِ اختلاف اور ان کے حامیوں کو اپنی کسی نزاع کے سلسلے میں جو بات بھی کہنی ہو، آپس

صاف نیت اور اخلاقی جرأت کے ساتھ قولِ سدید بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ تشبیب و گریز اور لف و نشر اور گرہ بندیوں کے اسالیب اختیار کر کے ایسی پُر تضاد، اُلجھی ہوئی، طنزیہ اور چیستانی باتیں نہیں کرنی چاہئیں کہ باہم دگر مغالطوں اور تندیٔ جذبات میں مزید اضافہ ہو۔ جو بھی دعویٰ یا شکایت یا اعتراض یا سوال برائے وضاحت طلبی ہو اُسے رشتۂ تعلق کو بل دیے بغیر سنجیدہ انداز میں بیان کرنا چاہیے۔ آدمی اگر کسی شخص کو بُرا سمجھتا ہے اور اُسے بُرا کہنا چاہتا ہے تو بہت زیادہ "اگر مگر" کے چکر میں پڑے بغیر قلب و ضمیر کی بات کہہ دینی چاہیے۔ بشرطیکہ اس سے مطلوب تعلقات کی بہتری، اُلجھنوں کا حل، اللہ کی رضا اور رُوح کی تسکین ہو۔ اسی طرح جس کے خلاف آپ کیس پیش کریں، اُس میں اگر کوئی خوبی ہو تو اُسے کھلے دل سے ایسے انداز میں تسلیم کریں کہ آگے پیچھے کے جملوں سے یہ تاثر نہ ہو کہ آپ نے چار و ناچار ایک بات تو کہی مگر اُسے ملیامیٹ کرنے کا سامان بھی کر دیا۔

۸ ـــ عام حالات میں بھی، اور نزاعی ماحول میں خصوصاً، جب کبھی کوئی شخص دوسرے کے متعلق کوئی واضح الزام یا اتہام لے کے آئے تو جس کے سامنے بھی بات ہو اُس کا اگر خدا پر ایمان اور تحریک سے لگاؤ ہو تو اس کی اوّلاً شرعی و اخلاقی اور ثانیاً تنظیمی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس پر دستاویزی یا شخصی شہادت طلب کرے۔ اس کے راویٔ اوّل یا ماخذ کا سراغ لگائے اور جرح و تنقید کر کے بات کو منقح کرے۔ یہ تعمیل ہوگی قرآنی حکم: "فتبینوا!" کی۔

جہاں ایک مرتبہ ایسا جماعتی یا سماجی ماحول بن جائے غلط بیانی یا غیبت یا نجویٰ کرنے والے یا چغلی کھانے والے یا دوسروں پر تہمت لگانے والے کسی بھی شخص کے لیے سخت مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی بھی شخص یاوہ گوئی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ غیبت ہو یا الزام تراشی، اِن خاردار جھاڑیوں کے اُگنے کے لیے ایک خاص طرح کی زمین اور آب و ہوا درکار ہوتی ہے۔ ایسی زمین اور ایسی آب و ہوا اپنے ہاں نہیں ہونی چاہیے۔

یہ بات بدترین گالی سے بڑھ کر ہے کہ کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ کسی کے ہاتھ بک گیا ہے یا فلاں کا آلۂ کار ہے۔ یا اُسے جماعت کے حلقے میں کارِ خاص کے لیے داخل کیا گیا ہے۔ جماعتِ اسلامی کا کوئی آدمی سنجیدگی سے یا طنزاً یا محض اذیت رسانی کے لیے اس طرح کی بھاری اور تلخ باتیں زبان یا قلم سے ادا نہیں کر سکتا ـــ تاوقتیکہ وہ حتمی ثبوت فراہم نہ کر سکے۔ دلائل

اور موقف کی کمزوری آدمی کو بعض اوقات مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے دعوٰی کے وزن کی کمی الزامات کے ذریعے پوری کرے۔

مگر اسلام میں اختلافات کا راستہ بہتانوں اور تہمتوں کا راستہ نہیں ہے۔ حد یہ کہ تہمتیں اخباروں میں چھپیں، اُن کا چرچا ہو، وہ قریب اور دُور کے ہزارہا افراد تک پہنچیں۔ ایسی زیادتی جس سے بھی سرزد ہو اُسے شرمسار ہونا چاہیے اور فریقِ متعلق سے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ خدا سے استغفار کرنا چاہیے۔ کسی شخص کو بدنیّت اور بے ضمیر قرار دینے کے بعد پھر بحث کاہے کی۔

یہ تو ایک عجیب منطق ہوئی کہ جب تک کسی ایک نکتے کا اختلاف واقع نہ ہوا ہو تو دونوں فریق ایک دوسرے کو اچھا سمجھتے ہوں اور تعریف کرتے ہوں۔ ابھی مؤقر و معظم اور بھی شستہ و شائستہ اور دونوں اسلامی ذہن و کردار کے دانشور اور قائد۔ مگر اختلاف ہونے کے بعد عزتوں اور شرافتوں اور قابلیتوں کا ایک دوسرے کی نگاہ میں خاتمہ ہو جائے۔

اختلاف کرنے والے کو مجرم بنا کر اس کے خلاف انتقام کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ پہلی کوشش رفعِ اختلاف کی ہو یا کم سے کم کسی اختلاف کے ہوتے ہوئے مل کر چلنے کی راہ نکالی جائے۔ یہ معرکہ سر کرنے میں اگر دونوں طرف کی دماغی صلاحیتیں اور اخلاقی احساسات کامیاب نہ ہوں تو پھر ثالثی اور ثالثی کے بعد ایک طرح کی عدالتی تحقیق کے ذریعے معاملے کو فیصل کرا کے دونوں فریقوں کو سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ یہ ممکن نہ ہو تو پھر ہنستے مسکراتے جدا ہونے کے بعد سارا قصہ بھول بھلا دینا چاہیے۔ اسے پلّے باندھ کے رکھنا اور پچھلی باتیں یاد کر کر کے اپنے اور نئے نئے نکتے ایجاد کر کے اور "جرمِ اختلاف" کی سزا دینے کی تدبیریں اختیار کر کر کے اپنے اور حریف کے اعصاب کی پسپائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ساری کارروائی ایک منفی کارروائی ہے۔ خدا خوفی سے آزاد آدمی یہ سوچتا ہے کہ جس نے اختلاف کی جسارت کی ہے اور گردن نہیں جھکائی ہے، اس کے لیے جینا دوبھر کر دیا جائے، اس کی عزت گھٹا دی جائے، اس کی ذات کو تنازعہ فیہ بنا دیا جائے، اس کے سلسلۂ روزگار کو درہم برہم کر دیا جائے اور اس کی شخصیت پر الزامات و اتہامات کا طومار ملبہ بنا دیا جائے۔

اگر نزاع کے دو فریقوں میں سے کوئی ایک بھی اس منفی راستے پر قدم رکھنے سے انکار کر دے تو دوسرا اکیلے ہاتھ سے تالی نہیں بجا سکے گا۔ آخر پہلے بھی تو مولینا مودودیؒ نے مثال قائم کی اور جماعت کے لوگ اب بھی اس کے زیر اثر کئی حملہ آوروں کے حملہ ہائے پے در پے کے باوجود ان کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ کیا کسی کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں۔

یہاں تک بھی ایک بات ہے کہ آپ [illegible] ایک بار دل کا [illegible] اُگل لیں [illegible] اس پہ بس نہیں تو دو بار سہی۔ مگر کسی "فی سبیل اللہ فساد" کے لیے اول درجے کے [illegible] کا میدان میں آجانا، کچھ کا اگلے مورچوں سے فائر کرنا اور کچھ کا دور پیچھے کا ہیڈ کوارٹر کیمپ کے تہ خانوں میں بیٹھ کر ہدایات جاری کرنا، اخبارات و رسائل میں مضامین کی اشاعت، پمفلٹوں کی مہم، پھر ریشمی رومال تحریک کی طرح مکاتیب کی مہم، مراسلوں کا اجرا، ملک کے اندر ہی نہیں، بین الاقوامی دائرے میں بھی، پھر کسی کی حمایت سے بعض افراد کو بدکنے کے لیے ان پر وفود کے ذریعے سماجی دباؤ — آخر یہ کوئی اسلامی یا شریفانہ اختلافات کے طریقے ہیں؟ پھر اپنی اپنی صفیں الگ کرنے کی کوششیں ایسی ہیں جیسے کوئی انتخابی معرکہ [illegible] درپیش ہے کہ ایک فریق زیادہ سے زیادہ ووٹ اپنی طرف جمع کر رہا ہے [illegible] اپنی طرف۔

کیا رسّہ کشی کے اکھاڑے کی ایسی داستانیں جماعتِ اسلامی کی رودادوں یا تاریخ کا جزو بننے کے قابل ہیں؟

مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اسلام کے لیے کام کرنے کو بار بار اٹھتے اور جمع تو ہوتے ہیں، لیکن ذرا ذرا سے اختلاف پر آپس میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ آگے چلتے ہیں، پھر اختلافات کی چھری ایک ٹکڑی کو کاٹ کر الگ کر دیتی ہے۔ جماعتیں بن بن کر بکھر جاتی ہیں۔ اتحاد قائم ہوتے ہیں اور نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ قائم و دائم ہے تو وہ ہے تفرقہ!

مصیبت اصلاً یہی ہے کہ اختلافات کے باوجود اتحاد [illegible]

[illegible] اختلافات سے علیحدہ رہنے کی صحیح [illegible]

دین کی سربلندی کا مشن لے کے اُٹھے ہیں، اس نے آدابِ اختلاف اور طریقہ ہائے حلِ نزاعات بھی ہم کو بتائے تھے۔ ان کو ہم جانتے بھی ہیں، مگر عملاً جب اختلافات کی آزمائش پیش آتی ہے تو وہ طریقے فراموش ہو جاتے ہیں۔ ہمارے قریبی بزرگ اور ساتھی جن کو اختلافات و نزاعات کے حل کے لیے غیر جانبدارانہ انداز سے کام کرنے کو موجود ہونا چاہیے وہ وقت پر خود جانب دار بن کر کھڑے ہو جاتے اور اپنے مرتبۂ قیادت اور دانشوری کے باوجود خادمانِ دین کو اختلافات سے پیدا ہونے والے خطروں سے نہیں بچا سکتے۔

جس دن اس مسئلہ کا حل مسلمانانِ پاکستان اور مسلمانانِ عالم نے نکال لیا، اس دن کوئی مزاحم قوت ہمارے سامنے کھڑی نہ رہ سکے گی۔ اور اس مدعا کے لیے فکری اور عملی رہنمائی بہم پہنچانا تحریکِ اسلامی پر بدرجہ اشد لازم ہے۔

حکمتِ سید مودودیؒ

کامیاب زندگی کا صحیح تصور

اقتباس کردہ:۔ محمد یوسف صاحب ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور

اس مرتبہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ایسی تحریر برآمد ہوئی جو ہمارے ناقص علم کے مطابق اب تک اپنے حلقے کے لٹریچر یا جرائد میں نہیں آئی۔ عنوان بھی دلچسپ ہے اور اس میں مولانا نے دعوتِ اسلامی کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ (ادارہ)

کامیاب زندگی کا کوئی تصور قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود زندگی کا کوئی تصور قائم کر لیا جائے۔ کیونکہ اسی پر کامیابی کا تصور مبنی ہو سکتا ہے۔ ایک تصورِ حیات کے لحاظ سے ایک زندگی انتہائی کامیاب قرار پاتی ہے، تو دوسرے تصورِ حیات کے لحاظ سے وہی زندگی انتہائی ناکام ٹھہرتی ہے۔ دنیا کو ایک چراگاہ یا خوانِ یغما سمجھیے تو وہ شخص بہت کامیاب ہے جو اس تھوڑی سی مہلتِ عمر میں خوب عیش کر لے، اور وہ بڑا ہی نامراد ہے جو نفس و جسم کے ابتدائی مطالبات بھی اچھی طرح پورے نہ کر سکے۔ دنیا کو ایک رزمگاہ سمجھیے تو کامیاب آدمی وہ ہے جو اس کشمکش کے میدان میں سب کو روندتا کچلتا آگے بڑھتا چلا جائے، یہاں تک کہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں اس کے جیتے جی کوئی حریف اس کی آرزوؤں کی تکمیل میں مزاحم ہونے والا نہ رہ جائے۔ اور اس کے برعکس وہ آدمی بالکل ہی ناکام نکما ہے جو اپنی اغراض کے لیے کسی ایک بندۂ خدا سے بھی چھین جھپٹ نہ کرے اور سفرِ حیات میں کبھی دو ہمراہیوں کو بھی کہنی مار کر آگے نہ نکلے۔ لیکن اگر آپ کا تصورِ حیات ان تصورات سے مختلف ہو تو کامیابی و ناکامی کے متعلق بھی آپ کا تصور ان سے مختلف ہو جائے گا۔ اتنا مختلف کہ آپ ان

لوگوں کو سخت ناکام و نامراد سمجھیں گے جو ان تصورات کے لحاظ سے بڑے کامیاب ہیں، اور ایسے لوگوں کو انتہائی کامیاب قرار دیں گے جو ان کے لحاظ سے قطعی ناکام ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کامیابی و ناکامی کا کوئی ایک متعین معیار نہیں جو دنیا بھر میں مسلّم ہو، بلکہ مختلف لوگوں کی نگاہ میں اس کے مختلف معیار ہیں۔ اور ان معیاروں کو متعین کرنے میں فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو، اور اس دنیا کو جس میں وہ رہتا ہے، اور اس مہلتِ عمل کو جو اسے یہاں حاصل ہے، کیا سمجھتا ہے؟

طولِ کلام سے بچتے ہوئے میں اختصار کے ساتھ یہ بتاؤں گا کہ ایک سچے مسلمان کی نگاہ میں فلاح و خسران کا حقیقی معیار کیا ہے۔ یہ معیار اسلام نے پیش کیا ہے اور ہمیشہ سے اہلِ ایمان اسی کے لحاظ سے رائے قائم کرتے رہے ہیں کہ فائز و کامران کون ہے اور نائب و خاسر کون۔

زندگی کا جو تصور اسلام ہمیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا ہے تاکہ انسان یہاں اس کے دیے ہوئے سروسامان اور اس کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے کر اپنی اصلی قدر و قیمت کا اظہار کرے۔ اس تصور کی رُو سے دنیا کوئی چراگاہ یا رزم گاہ نہیں ہے، بلکہ ایک امتحان گاہ ہے۔ جس چیز کو ہم اپنی زبان میں عمر کہتے ہیں، وہ دراصل وہ وقت ہے جو امتحان کے پرچے کرنے کے لیے ہم کو دیا گیا ہے، اور امتحان کے پرچے بے شمار ہیں۔ ماں باپ، اولاد، بیوی، شوہر، بھائی بند، رشتہ دار، دوست، ہمسائے، قوم، وطن اور پوری انسانیت جس کے ساتھ طرح طرح کے تعلقات و روابط میں انسان بندھا ہوا ہے، ان میں سے ہر ایک امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اپنی معاش کے سلسلے میں اور جن جن طریقوں سے بھی انسان کام کرتا ہے اور پھر اس کمائی کو جس جس طرح خرچ کرتا ہے، یہ سب بھی امتحان ہی کے مختلف پرچے ہیں۔ اسی طرح جتنی قابلیتیں اور قوتیں اللہ نے اس کو دی ہیں، جو جو خواہشیں اور میلانات اور جذبات اس میں رکھے ہیں، جن جن ذرائع اور وسائل سے کام لینے کی اس کو قدرت عطا کی ہے، ان سب کی اصل حیثیت بھی امتحان کے پرچوں ہی کی ہے اور سب سے بڑا پرچہ اس مضمون کا ہے کہ پہلے اس خالق کے ساتھ انسان کیا رویہ اختیار کرتا ہے، جس کی دنیا میں وہ رہتا ہے، جس کی دی ہوئی قوتوں اور طاقتوں سے وہ کام لیتا ہے، اور جس کے بخشے ہوئے سروسامان کو وہ استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر امتحان ہے، جس کی لپیٹ میں زندگی کا ہر پہلو آیا ہوا ہے اور ہمہ وقتی امتحان

ہے جس کا سلسلہ ہوش سنبھالنے کے وقت سے موت کی آخری ساعت تک جاری رہتا ہے۔

اِس امتحان گاہ میں اصلی اہمیت اس چیز کی نہیں ہے کہ آپ کس مقام پر، کس حیثیت میں امتحان دے رہے ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جو شخص یہاں مزدور کی حیثیت سے اٹھ کر ایک بڑا کارخانہ دار، یا رعیت کے مقام سے بلند ہو کر ایک بڑا فرمانروا بن گیا ہے، اُس نے درحقیقت کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ہے، بلکہ امتحان کے بہت سے زائد پرچے اُس نے اپنے لیے بڑھا لیے ہیں اور پہلے کی بہ نسبت وہ زیادہ سخت پرچے لے کر بیٹھ گیا ہے، جہاں نمبر زیادہ پانے کے جتنے امکانات ہیں، اتنے ہی زیادہ ناکامی کے خطرات بھی ہیں۔

یہ امتحانی تصورِ حیات جس شخص کا بھی ہو، اس کا معیارِ کامیابی و ناکامی لازماً دوسرے تصوراتِ حیات رکھنے والوں کے معیار سے بالکل مختلف ہوگا۔ اس کے نزدیک اصل کامیابی خدا کے اس امتحان میں ایک بندۂ وفادار و شکرگزار ثابت ہونا ہے۔ ایک ایسا بندہ ثابت ہونا ہے جس نے خدا کے اور بندوں کے حقوق ٹھیک ٹھیک سمجھے اور ادا کیے ہوں، جس نے دل اور نگاہ، کان اور زبان پیٹ اور جنسی قوتوں کو بالکل پاک رکھا ہو۔ جس کے ہاتھوں نے کسی پر ظلم نہ کیا ہو، جس کے قدم بدی کی راہ پر نہ چلے ہوں، جس نے کم کمایا ہو یا زیادہ، مگر جو کچھ بھی کمایا ہو حق اور راستی کے ساتھ کمایا اور جائز راستوں میں خرچ کیا ہو۔ جو امانتوں کا محافظ، قول و قرار میں سچا اور عہد و پیمان میں راسخ رہا ہو۔ جو بھلائی کا دوست اور بُرائی کا دشمن ثابت ہوا ہو۔ جسے اس کے خدا نے جس حیثیت میں بھی رکھا ہو وہاں اس نے اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہٗ سمجھا اور ادا کیا ہو۔ جس کا یہ حال نہ رہا ہو کہ بقول ظفر:

ع۔ جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

یہ کامیابی جس کو نصیب ہوگئی، وہ بہر حال فائز المرام ہے، خواہ دُنیا میں وہ نانِ جویں تک کو محتاج رہا ہو اور کوئی اس کا کارنامہ تاریخ کے صفحات پر ثبت نہ ہو۔ اس کے برعکس جو اس کامیابی سے محروم رہ گیا وہ سخت نامراد ہے خواہ وہ دُنیا کے سرمایہ داروں کی صفِ اوّل میں پیشوائی کا مقام حاصل کر گیا ہو یا فاتحینِ عالم کا سرخیل ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔

لاہور - ۲ / جولائی ۱۹۵۸ء

(ماخوذ از "کامیاب زندگی کا تصور" مکتبہ جدید لاہور ۱۹۶۲ء)

عباسی دور میں فروغِ علوم

جناب عبد الرشید عراقی صاحب

(۲)

عہدِ عباسی میں دوسرے اسلامی علوم و فنون کا تذکرہ

عہدِ عباسی میں تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں محدثین کرام نے جو علمی خدمات سرانجام دیں۔ اس کا تذکرہ اور تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ محدثین کرام نے تدوین حدیث کے ساتھ ساتھ دوسرے اسلامی علوم یعنی تفسیر، فقہ، تاریخ، سیرت و مغازی، اسماء الرجال، ادب، لغت وغیرہ پر جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور اس سلسلہ میں جو علمی و تحقیقی کتابیں تصنیف کیں اُن کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اور یہاں صرف پانچ فنون یعنی تفسیر[۱]، فقہ[۲]، تاریخ[۳]، سیرت[۴] اور اسماء الرجال[۵] پر عہدِ عباسیہ میں جو علمی و تحقیقی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے گئے۔ اُن کا ایک مختصر خاکہ پیشِ خدمت ہے۔

تفسیر عہدِ عباسیہ میں تفاسیر قرآن مجید کے سلسلے میں جو کام ہوا۔ اس میں مفسرین کرام نے اپنے اپنے رنگ میں تفسیر قرآن پر کام کیا۔ ہر ایک تفسیر کا رنگ جداگانہ ہے۔

مفسرین کرام کے ایک طبقہ نے تفسیر میں صحابہ اور تابعین کے اقوال سے سند لی، اور بعض مفسرین نے صحابہ کرام کے اقوال کی توضیح و ترجیح اور استنباط سے بحث کی۔ کسی مفسر نے فوائد کا اضافہ کیا۔ کسی نے اسانید کو حذف کیا وغیرہ وغیرہ۔ اب یہاں تاریخی ترتیب کے ساتھ چند مشہور تفاسیر کی تفصیل پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ تفسیر — امام عبد اللہ بن زبیر حمیدی (م ۲۱۹ھ)

۲۔ کتاب التفسیر — امام ابوبکر بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ)

۳ ـــ کتاب التفسیر امام ابوبکر بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ)

۴ ـــ کتاب التفسیر امام احمد بن حنبل الشیبانی (م ۲۴۱ھ)

۵ ـــ کتاب التفسیر امام عبد بن حُمَید (م ۲۴۹ھ)

۶ ـــ کتاب التفسیر امام ابو محمد عبداللہ دارمی (م ۲۵۵ھ)

۷ ـــ التفسیر الکبیر امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری (م ۲۵۶ھ)

۸ ـــ کتاب التفسیر امام محمد بن یزید بن ماجہ (م ۲۷۳ھ)

۹ ـــ تفسیر تستری امام ابو عبدالرحمٰن بیہقی بن مخلد (م ۲۷۶ھ)

۱۰ ـــ تفسیر ابن جریر امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ)

۱۱ ـــ کتاب التفسیر امام ابو القاسم طبرانی (م ۳۶۰ھ)

۱۲ ـــ تفسیر ابن عطیہ امام ابو عبداللہ بن عطیہ دمشقی (م ۳۸۳ھ)

۱۳ ـــ تفسیر ثعلبی امام ابو اسحاق احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی (م ۴۲۷ھ)

۱۴ ـــ تفسیر امام واحدی امام علی بن احمد بن محمد ابو الحسن الواحدی نیشاپوری (م ۴۶۸ھ)

۱۵ ـــ تفسیر معالم التنزیل محی السنہ امام محمد بن حسین بن مسعود الفراء البغوی (م ۵۱۹ھ)

۱۶ ـــ تفسیر کشاف علامہ محمود بن عمر زمخشری (م ۵۳۸ھ)

۱۷ ـــ احکام القرآن امام ابوبکر محمد بن عبداللہ العربی (م ۵۴۳ھ)۔

امام ابن العربی نے فنِ تفسیر سے متعلق دو علمی کتابیں کتاب الناسخ والمنسوخ اور قانون التاویل کے نام سے لکھیں اور اہلِ علم نے ان دونوں کتابوں کو فنِ تفسیر میں امام ابن العربی کی بہترین کاوش قرار دیا ہے۔

۱۸ ـــ تفسیر ابن جوزی امام عبدالرحمٰن الجوزی (م ۵۹۷ھ)

۱۹ ـــ تفسیر کبیر امام فخر الدین محمد بن عمر رازی (م ۶۰۶ھ)

فقہ اسلامی علوم و فنون میں فقہ بھی ایک اہم فن ہے۔ علامہ ابن خلدون فقہ کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

"مکلف انسانوں کے افعال و اعمال احکام خدا از قبیل وجوب و حرام و حلال و مباح

کا جاننا فقہ کہلاتا ہے۔ یہ علم کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے مقرر کردہ اصول و احکام سے مستنبد و ماخوذ ہے۔ جو احکام کتاب و سنت کے مبادی اصل سے نکالے جاتے ہیں فقہی کہلاتے ہیں[1]

عہدِ عباسیہ میں اسلامی فقہ نے نشو و نما پائی اور اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے ایسے ضوابط اخذ کیے گئے۔ جو ایک مسلمان کی شب و روز کی زندگی کو دائرہ اسلام میں رکھنے کے لیے ممد و معاون ثابت ہوں۔ یہ ضوابط ایک مسلمان کی معاشی، اقتصادی، اخلاقی، سیاسی، عمرانی اور عبادات سے متعلق تھے۔ ان ضوابط و قوانین کا نام فقہ ہے اور ان کے اصولوں کا نام اُصول فقہ۔ ملتِ اسلامیہ میں فقہ نے خوب ترقی کی۔

عہدِ نبوی میں علمِ فقہ کوئی مدوّن علم نہ تھا۔ صحابہ کرام کو جب کسی مسئلہ میں مشکل پیدا ہوتی تھی تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل کا جواب دریافت کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام عوام کے مسائل حل کر دیتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد جب تابعین کا زمانہ آیا، فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ خالص عربی تمدن میں عجمی تمدن داخل ہوا۔ معاشی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب آیا۔ تجارت کا دائرہ وسیع ہوا تو اس وقت فقہ کی تدوین کی ضرورت پیش آئی۔

دورِ عباسیہ میں فقہ پر سب سے پہلے امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) نے توجہ کی اور آپ کے بعد آپ کے تلامذہ میں سے امام ابو یوسف (م ۱۸۲ھ) اور امام محمد بن حسن (م ۱۸۹ھ) فقہ کی تدوین میں کافی سعی و کاوش کی۔ مگر امام محمد بن ادریس شافعی (م ۲۰۴ھ) جو خود ایک فقہی مسلک کے بانی ہیں۔ اُنھوں نے فقہ کی تدوین میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہ تاریخ اسلام میں ایک سنگِ میل ہے۔ اور آپ نے فقہ کے بارے میں جو اصول و ضوابط منضبط کیے، وہ علمی دنیا کے لیے سرمایۂ صد افتخار ہیں۔

امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) فقہی مسلک کے بانی ہیں۔

مسلک مالکی امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) سے منسوب ہے۔ مسلک شافعی کے بانی امام محمد

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۸۷

بن ادریس شافعی (م ۲۰۴ھ) ہیں۔ اور حنبلی مذہب کے بانی امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) ہیں۔

عباسی دور میں اسلامی فقہ اور مذاہب اربعہ یعنی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی پر زبردست کام ہوا اور اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ یہاں عباسی دور کی چند مشہور اور معروف کتابوں کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

۱۔ المدونۃ الکبریٰ امام عبدالرحمٰن بن قاسم (م ۱۹۱ھ)
۲۔ کتاب الام امام محمد بن ادریس شافعی (م ۲۰۴ھ)
۳۔ کتاب السنن فی الفقہ امام ابوبکر بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ)
۴۔ کتاب السنن فی الفقہ امام اسحاق بن راہویہ (م ۲۳۸ھ)
۵۔ کتاب الاعتقاد امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ)
۶۔ کتاب المتضاد امام اسحٰق بن بہلول (م ۲۵۲ھ)
۷۔ کتاب الجامع امام ابو محمد عبداللہ دارمی (م ۲۵۵ھ)
۸۔ کتاب قضایا الصحابہ والتابعین۔ امام محمد بن اسمٰعیل البخاری (م ۲۵۶ھ)
۹۔ کتاب لاحمد بن حنبل۔ امام مسلم بن حجاج (م ۲۶۱ھ)
۱۰۔ کتاب المسائل۔ امام ابوداؤد السجستانی (م ۲۷۵ھ)۔
۱۱۔ قیام اللیل و کتاب رفع الیدین۔ امام محمد بن نصر مروزی (م ۲۹۴ھ)
۱۲۔ کتاب التوحید والصفات
۱۳۔ فقہ حدیث بریرہ } امام ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)
۱۴۔ کتاب الفرائض
۱۵۔ النوادر والفقہ
۱۶۔ بیان السنۃ والجماعۃ
۱۷۔ کتاب الاختلاف بین الفقہا } امام ابوجعفر طحاوی (م ۳۲۱ھ)
۱۸۔ کتاب الہدایہ الی علم السنن امام ابن حبان (م ۳۵۴ھ)
۱۹۔ کتاب المعرفۃ مذاہب الفقہاء امام ابوالحسن دارقطنی (م ۳۸۵ھ)

۲۰ — کتاب المبسوط	امام بیہقی (م ۴۵۸ھ)
۲۱ — کتاب الاعتقاد	
۲۲ — کتاب القراءۃ خلف الامام	
۲۳ — کتاب تلخیص المتشابہ فی اسم و عن نوادر التصحیف والوہم	ما اشکل منہ — امام ابوبکر خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ)
۲۴ — الانصاف فی مسائل الخلاف	امام ابوبکر محمد بن عبداللہ العربی (م ۵۴۳ھ)
۲۵ — کتاب الاحکام	امام ابو عبداللہ بنیا مقدسی (م ۶۲۳ھ)

(باقی)

جُمُعَہ

جناب چوہدری عبدالواحد گوندل صاحب - گوجرانوالہ

نماز کے لیے بھاگ کر آنے کی ممانعت | فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ یعنی دوڑ و اللہ کے ذکر کی طرف سے مراد بھاگ کر جانا نہیں، بلکہ جمعہ کے لیے سرگرمی دکھانا مراد ہے۔ سعی سے جدوجہد، کوشش اہتمام اور دوڑ دھوپ مراد ہے۔ رسول اکرمؐ نے بھاگ کر نماز میں شامل ہونے سے منع کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا جب نماز کھڑی ہو جائے تو اس کی طرف سکون اور وقار کے ساتھ چل کر آؤ بھاگتے ہوئے نہ آؤ۔

بخاری اور مسلم میں حضرت قتادہؓ کی روایت ہے کہ ہم حضورؐ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے کہ یکایک لوگوں کے بھاگنے کی آواز آئی۔ نماز ختم ہونے پر حضورؐ نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہ آواز کیسی تھی؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ ہم نماز میں شامل ہونے کے لیے بھاگ کر آ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو۔ نماز کے لیے پورے سکون سے آؤ، جتنی مل جائے اس کو امام کے ساتھ پڑھو جو چھوٹ جائے اسے بعد میں مکمل کر لو۔ یہاں ایک دوسری قراءت بھی نقل کی گئی ہے۔ فامضوا الیٰ ذکر اللہ۔ اس کا مطلب چلنا اور اس کی طرف جانا ہے۔

خرید و فروخت ختم | وَذَرُوا الْبَیْعَ ۔ اس وقت خرید و فروخت بند کر دو۔[1]

اذانِ جمعہ کے بعد خرید و فروخت حرام ہے۔ بلکہ نمازِ جمعہ کی تیاری کے علاوہ ہر قسم کی مصروفیت ختم کر دینی چاہیے۔ بیع جیسی حلال چیز کو حرام کر دیا گیا ہے۔ اس سے اذانِ جمعہ کے وقت ا

---

[1] مفہوم وسیع ہے کہ معاش اور دنیوی معاملات ختم کر دو۔ (مدیر)

کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جمعہ کی نماز فرض عین ہے۔ ظہر کے فرض اس کے لیے ساقط کر دینے سے بھی اس کے اہم تر فرض ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

ترکِ جمعہ پر وعیدیں

حضورؐ نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی اور شخص کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کر دوں اور جا کر ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آتے۔ (روایت ابن مسعودؓ بحوالہ مسند احمد)۔ رسول اکرمؐ نے جمعہ کے خطبہ میں فرمایا: لوگوں کو چاہیے کہ جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ ان لوگوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دے گا اور وہ غافل ہو جائیں گے۔ (روایت ابن عمرؓ و ابوہریرہؓ) اسی مضمون کی ایک روایت جابرؓ بن عبداللہ کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: جو شخص کسی حقیقی ضرورت اور عذر شرعی کے بغیر محض لاپروائی سے مسلسل تین جمعہ چھوڑ دیتا ہے اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ ابوداؤد میں یوں ہے کہ اللہ اس کے دل کو منافق کا دل بنا دیتا ہے۔ ابن ماجہ میں جو روایت ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "آج سے قیامت تک تم لوگوں پر جمعہ فرض کیا گیا ہے جو شخص اس کو معمولی چیز سمجھ کر یا اس کا حق نہ مان کر اس کو چھوڑ دے … اس کا حال درست نہ کرے، نہ اسے برکت دے۔ خوب سن لو، اس کی نماز، نماز نہیں۔ اس کا روزہ، روزہ نہیں۔ اس کا حج، حج نہیں۔ اس کی کوئی نیکی قابلِ قبول نہیں جب تک وہ توبہ نہ کرے، اللہ اس کو معاف کرنے والا ہے۔"

وجوبِ جمعہ اور اس سے استثنا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جمعہ ہر اس شخص پر فرض ہے جو اس کی اذان سنے۔ (ابوداؤد) حضرت حفصہؓ کی روایت کے مطابق جمعہ کے لیے نکلنا ہر بالغ کے لیے واجب ہے۔ طارق بن شہاب کی روایت میں آپؐ کا ارشاد یوں ہے کہ جمعہ ہر مسلمان پر پڑھنا واجب ہے سوائے اندھے، غلام، عورت، بچے اور مریض کے۔ ایک روایت میں مسافر کو بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ امام نسائی نے بروایت حضرتِ حفصہؓ بیان کیا ہے کہ بلاعذر ترکِ جمعہ پر وعید ہے۔

جمعہ کیسی بستی میں ہو سکتا ہے

جمعہ کی نماز ہر مقام پر ہو جاتی ہے جہاں اتنے لوگ جمع ہو جائیں کہ جن سے جماعت ہو جائے۔ یعنی تین۔ بعض نے جمعہ کی فرضیت کے لیے کچھ اور شرائط بھی

عاید کی ہیں۔ مثلاً معتدبہ نمازیوں کی حاضری (۴۰ افراد تک)[1] مصر جامع کا ہونا یعنی ایسا قصبہ جس میں بازار ہو اور حاکم مسلمان ہو وغیرہ۔ لیکن کتاب و سنت سے ان چیزوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے[2]۔

مزید مسائل جمعہ کے دن نمازِ جمعہ سے پہلے ضرورت ہو تو سفر کیا جا سکتا ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ سفر جمعہ کے بعد شروع کیا جائے۔

جمعہ کی نماز کے بعد آپؐ نے دو رکعت سنت اکثر پڑھی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت کے مطابق آپ گھر واپس آکر چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ کے مطابق بات یہ ہے کہ حضورؐ نمازِ جمعہ کے بعد مسجد میں کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے، جب گھر لوٹ جاتے تو دو رکعت پڑھتے تھے۔ حضرت ابنِ عمرؓ جب مکہ میں ہوتے تو نماز جمعہ کے بعد دو رکعت نماز پڑھتے، پھر چار رکعت پڑھتے لیکن جب مدینہ میں ہوتے تو نمازِ جمعہ کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے۔ جب اُن سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: "رسولؐ اللہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے" امام مسلمؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ نے چار رکعت کی تلقین کی تھی۔ بہرحال دو رکعت نمازِ سنت جمعہ کے بعد لازماً پڑھنی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور منافقون اور کبھی سورہ اعلیٰ اور غاشیہ پڑھا کرتے تھے۔ جمعہ کے دن نمازِ فجر میں الم سجدہ اور سورہ دہر پڑھنا سنت ہے۔

اگر جمعہ اور عیدین ایک ہی دن ہوں تو نمازِ جمعہ مستحب ہو جاتی ہے۔ فرضیتِ جمعہ ساقط ہوگی[3]۔

نمازِ جمعہ کے لیے خاص تیاری جمعہ کے دن غسل کرنا، مسواک کرنا، خوشبو لگانا اگر میسّر ہو، سفید کپڑے پہننا یا جو اچھے کپڑے میسّر ہوں، پہننا سنت ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نمازِ جمعہ کے لیے جانے سے قبل ناخن ترشواتے اور لبوں کے بال چھوٹے کرواتے تھے (طبرانی اوسط) حضرت ابو درداؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جو لوگ جمعہ کے روز عمامہ (پگڑی) باندھتے ہیں اُن پر اللہ تعالیٰ رحمت برساتے ہیں اور فرشتے اُن کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ (طبرانی کبیر)۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اکرمؐ نے فرمایا جب آدمی اپنے گھر سے مسجد میں جانے کے لیے نکلتا ہے

---

[1] فقہ حنفی کے مطابق تین مقتدیوں کا ہونا نمازِ جمعہ کی شرط ہے۔ [2] یہ دعویٰ محلِ نظر ہے
[3] جمہور کا مسلک یہ ہے کہ عید و جمعہ کی دونوں نمازیں پڑھی جائیں گی۔ کوئی ساقط نہیں ہوگی۔

تو اُس کے ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔

فضائلِ جمعہ ترمذی میں روایت ہے کہ جو شخص جمعہ کی رات سورہ حٰمٓ الدخان پڑھے گا۔ اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جو شخص جمعہ کی رات یا دن میں حٰمٓ الدخان پڑھتا ہے اُس کے لیے جنت میں گھر بنایا جائے گا۔ (طبرانی) ابن مردویہ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھے گا اُس کو ایک ایسا نُور دیا جائے گا جو اُس کے قدموں کے نیچے سے لے کر آسمان کی بلندی تک روشنی کر دے گا اور یہ نور اُس کے لیے قیامت تک روشن رکھا جائے گا۔ اور اُس کے ایک جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک کیے جانے والے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (اللمعہ فی خصائص الجمعہ للسیوطی، ابن کثیر)۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں جو آدمی جمعہ کا روزہ رکھنا چاہتا ہے تو وہ اس کے ساتھ ایک دن پہلے یا بعد کا روزہ بھی ملا کر رکھے، اکیلا جمعہ کا روزہ نہ رکھے، بلکہ جمعرات اور جمعہ یا جمعہ اور ہفتہ کا روزہ رکھا جائے۔ (بخاری اور مسلم)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جمعہ کی نماز مساکین کا حج ہے (ابن زنجویہ) یعنی جمعہ کی نماز کا ثواب اس قدر ہے کہ مساکین کے لیے حج کے ثواب کے برابر ہے۔

خطبۂ جمعہ حضرت جابر بن سمرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے پڑھتے تھے اور درمیان میں بیٹھتے تھے۔

امام شافعیؒ کے مطابق دو خطبے ضروری ہیں۔ امام احمدؒ، امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک خطبہ بھی درست ہے یا کافی ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا فرض ہے۔ جب کہ جمہور علماء اس کو سنّت کہتے ہیں۔ دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنے کے وقت حضورؐ سے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا ثابت نہیں۔ صرف ایک مرتبہ قحط اور بارش کی بندش کی صورت کی صورت میں آپ نے ایک ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی تھی۔ اس کا ذکر حضرت انسؓ بن مالک کی روایت میں ہے جو کہ بخاری میں ہے۔

قبولیتِ دُعا کی گھڑی ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا یہ دن تمہارے سب دنوں

ہے افضل ہے۔ اس دن مجھ پر درود بھیجا کرو۔ یہ درود میرے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔
حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جمعہ میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اگر مسلمان اس میں دعائے خیر کرے تو یہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ یہ ساعت اور گھڑی جمعہ میں کس وقت ہوتی ہے؟ اس کا تعین لیلۃ القدر کی طرح مشکل ہے۔

امام بیہقی نے لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ القدر کی طرح اس ساعت کو بھی جانتے تھے۔ پھر جس طرح شبِ قدر کی تعیین آپ کو بھلا دی گئی اسی طرح اس ساعت کی تعیین بھی اللہ کی طرف سے بھلا دی گئی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی ایک روایت بھی اس کی تائید میں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ساعتِ جمعہ کے متعلق چالیس سے زیادہ اقوال نقل کیے ہیں۔ آپ نے ان میں سے مسلم کی روایت کردہ اس حدیث کو ترجیح دی ہے کہ ساعتِ جمعہ سے وہ ساعت مراد ہے جو خطبہ کے لیے امام کے برآمد ہونے سے لے کر نماز کے ختم ہونے تک ہے۔ اکثر علماء نے حضرت عبداللہؓ بن سلام کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت کو اختیار کیا ہے کہ یہ یومِ جمعہ کی آخری ساعت ہے۔ امام نسائی نے حضرت جابرؓ کی روایت کو بیان کیا ہے کہ اس کو عصر کے بعد دن کے آخری وقت میں تلاش کرو۔ بعض نے کہا اس سے وہ وقت مراد ہے کہ جب امام دونوں خطبوں کے درمیان توقف کر کے بیٹھتا ہے۔

بعض علماء نے اس کی تطبیق اس طرح کی ہے کہ جس جگہ جمعہ کی نماز نہیں پڑھی جاتی وہاں یہ ساعت جمعہ کی آخری ساعت ہوتی ہے۔ لیکن جہاں جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے وہاں کے لوگوں کے لیے یہ ساعتِ مقبولیت نمازِ جمعہ کے دوران کی ساعت ہوگی۔ امام مسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت بیان کی ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود سنا ہے کہ حضورؐ ساعت مقبولیت کے متعلق فرما رہے تھے کہ وہ ساعت امام کے منبر پر بیٹھنے اور نماز کے ختم ہونے کے درمیان ہے۔

(باقی)

واہگہ کے اُس پار

جناب حمید انصاری عدنان صاحب

بھارتی مسلمانوں پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کی عنداللہ اور عندالناس جوابدہی ہم پاکستانی مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ جس وعدے پر ہم نے پاکستان بنایا اور جس کی خاطر بھارتی مسلمانوں نے اپنے خوفناک مستقبل کا اندازہ رکھتے ہوئے قربانی دی، یعنی اسلامی نظام کا قیام، اس وعدے کا ایفا کرنا ہمارے ذمے قرض ہے۔ بھارت کے واقعات و احوال بار بار ہمارے ضمیروں کو کچوکے لگاتے ہیں۔

(ادارہ)

شاہ بانو کیس کے سلسلے میں بھارتی سپریم کورٹ کے فیصلے کی سیاہی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ راجستھان ہائی کورٹ نے بھی ایک مسلم مطلقہ خاتون مریم کے حق میں نفقہ ادا کرنے کا حکم دے دیا۔ بھارتی مسلمان مسلم پرسنل لا میں مداخلت پر پہلے ہی مشتعل تھے، نئے عدالتی فیصلے سے ان کے غم و غصے میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ احتجاجی مظاہروں، جلسے اور جلوسوں میں شدت آگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد بھارتی سیکولرازم کی مسلم دشمنی حد سے تجاوز کر چکی ہے۔ خونِ مسلم کی ارزانی کا یہ عالم ہے کہ دکن کے ساحلوں سے لے کر لداخ کے پہاڑوں تک کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں آئے دن کسی مسلمان کا گلا نہ کٹتا ہو، اور جہاں مسلمانوں کی آبرو نہ لٹتی ہو۔ استحصال درجہ کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ معاشی اور سماجی طور پر اُن کو پستیوں میں دھکیل دیا گیا ہے۔ ان کی تہذیب و ثقافت پر منظم حملے کیے جاتے ہیں۔ اُن کو بھارت کے شہری ہوتے ہوئے "پاکستانی" کہا جاتا ہے

اور پاکستان کا جاسوس سمجھا جا رہا ہے۔ ایک بھارتی مسلمان نے بھارت میں مسلمانوں کی حالتِ زار کے بارے میں جو تجزیہ کیا، اس کا ایک فقرہ قابلِ غور ہے:

"جب تک ہم متاعِ دین و ایمان لٹا نہیں دیتے، ہندو ہمیں کبھی بھارت کا شہری نہیں سمجھے گا۔"

گذشتہ برس کلکتہ کے متعصب ہندوؤں نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ قرآنِ پاک پہ پابندی لگا دی جائے۔ مسلمانوں کے زبردست احتجاج کے بعد اعلیٰ عدالت نے اس مقدمے کو خارج کر دیا۔ اس سال ملک کی سب سے سینیئر عدالت کے پانچ ججوں نے طلاق و نکاح کے مسلّمہ اسلامی قانون کے خلاف فیصلہ دیا اور مسلمانوں کے بے حد و حساب احتجاج کی پروا نہیں کی۔ پروا تو کجا اسلام دشمنی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

عدالتوں کے علاوہ بھارتی پریس پہ قابض متعصب اکثریت مسلمانوں کو زک پہنچانے، ان کے عقائد و نظریات کے منافی تحریریں چھاپنے اور ان کے خلاف حکومت اور عوام کو بھڑکانے میں سرگرم رہتی ہے۔ ہندو پریس کی مسلم دشمنی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱- ۲۲ دسمبر ۱۹۸۵ء کو سنڈے ایکسپریس میگزین" میں مسٹر کامتھ کا ایک مضمون "یکساں سول کوڈ" کے بارے میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے ہندو اکثریت اور حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مسلم پرسنل لا کو ختم کر کے یکساں کوڈ نافذ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں، اور اورنگ زیب کے ظلم و جبر کو اپنے لیے مثال نہ بنائیں۔ کامتھ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"ہندوستان کے شہری قوانین کو سیکولر بنانا اور تمام شہریوں پر خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب و عقیدے سے ہو، یکساں طور پر نافذ کرنا انتہائی مطلوب ہے۔ لیکن عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنے یہاں کی تبدیلی یا اصلاح کی رفتار خود متعین کریں، تاکہ ظلم و جبر کا الزام ہندوؤں پہ کبھی نہ لگایا جائے۔ ہندوؤں کو اپنا نمونہ اورنگ زیب کے بجائے اپنے اعلیٰ و ارفع ضمیر کو بنانا چاہیے۔"

۲- الٰہ آباد سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار PROBE نے آر بالا شنکر کا ایک انتہائی زہر مضمون شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں جنوبی ہند کی ریاست کیرالا کے ایک ضلع ملاپورم

کو خطرناک مسلم اکثریت کا علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "ملاپورم ــ منی پاکستان"۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہاں کے مسلمان دم گھٹنے کی حد تک اسلامی حدود و قیود پر عمل پیرا ہیں اور خطرناک انداز میں اسلامیت کے احیاء کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے تو ہندوستان کی سلامتی کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ مضمون نگار نے مزید لکھا ہے کہ یہاں پاکستان کی فتح پر پٹاخے چھوڑ کر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ لوگ جماعت اسلامی کے اشارے پر پاکستانی حکومت اور نظامِ مصطفیٰ کے حق میں پروپیگنڈا کرتے ہیں اور ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے۔ بالا شنکر نے اس امر پر بھی اظہار تشویش کیا ہے کہ لوگ رمضان کے روزے باقاعدگی سے رکھتے ہیں اور مساجد میں مذہبی جنون سے جاتے ہیں۔ جمعے کے روز ہندوؤں کو بھی دکانیں بند کرنے کا مجبور کیا جاتا ہے اور رمضان میں غیر مسلم بھی کھلم کھلا کھانا نہیں کھا سکتے۔ مضمون نگار نے "منی پاکستان" کی جو تصاویر شائع کی ہیں، وہ زیادہ تر مساجد کی ہیں۔ دو کیپشن ملاحظہ ہوں:

"ملاپورم، ہر جگہ مسجدیں، آدھے کلومیٹر میں پانچ مسجدیں"

"کوزے کوڈے شہر ــ مسجد شہر کے عین درمیان میں"

مضمون نگار نے مقامی مسلمانوں پر سمگلنگ اور جاسوسی کے الزامات عائد کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہاں پاکستان کے ایجنٹ آزادانہ پھرتے ہیں۔

۳ ــ چنڈی گڑھ بھارتی پنجاب کا دارالحکومت ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والے ایک ماہانہ جریدے "جے کمبوج" نے دسمبر ۸۵ء کے شمارے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے بارے میں انتہائی توہین آمیز مواد چھاپا۔ مضمون نگار ڈاکٹر ڈی ایس رشی نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی عقیدت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف سے غازی علم دین شہیدؒ کے نقشِ قدم پر چلنے والے ایک مسلمان نوجوان محمد سرور نے ڈاکٹر رشی کے جسم میں خنجر بھونک دیا۔ اگرچہ وار اوچھا پڑا، لیکن گستاخِ رسولؐ ابھی تک ہسپتال میں ہے۔ بھارتی مسلمانوں نے اس پر بھرپور احتجاج کیا۔ (بدقسمتی سے پاکستانی پریس میں ابھی تک یہ خبر نہیں آئی)۔

۴ ــ ہندو اخبارات نے اردو (جو بھارتی مسلمانوں کی ملی زبان ہے) کے خلاف مہم چلا رکھی

ہے۔ ان میں ایسے مضامین، خبریں اور تجزیے چھپتے ہیں جن میں اُردو کا تنگ دامن اور فرقہ واریت کی حامل زبان کے طور پہ ذکر کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ اُردو اور اسلام کی تنگنائیوں سے نکلیں جو اُن کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مرکزی حکومت نے حال ہی میں ایک سرکلر جاری کیا ہے جس میں ایسے خود مختار اداروں کو جنھیں حکومت امداد دیتی ہے، کہا گیا ہے کہ وہ ہندی کے بغیر کوئی زبان استعمال نہ کریں، ورنہ اُن کی سرکاری امداد بند کر دی جائے گی۔ اگرچہ دباؤ کے بعد یہ سرکلر واپس لے لیا گیا، لیکن اس واپسی پہ ہندو اخبارات نے طوفان کھڑا کر رکھا ہے۔ وہ ہندی کے حق میں اور اُردو کے خلاف باقاعدہ مہم چلا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک کا نظام چلانے اور عوام کو متحد رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ صرف ہندی ہی ملک کی زبان ہو۔ ہر تحریک کی تان اُردو کی مخالفت پہ ٹوٹتی ہے۔ وہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پہ اُردو کے پروگراموں کے بھی مخالف ہیں۔

مسلم تہذیب اور ثقافت کا رشتہ ماضی سے توڑنے اور ہندو تہذیب سے خلط ملط کرنے کی واضح اور منظم کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں بھارتی ٹیلی وژن کا کردار خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ گذشتہ ہفتے جالندھر ٹیلی وژن سے ایک ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہوا۔ اس میں ایک عدالت کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ ایک باریش ملزم کٹہرے میں کھڑا ہے۔ وکیلِ استغاثہ سوال کرتا ہے۔

تمھارا نام؟

"عبدالرحمٰن" — جواب ملتا ہے۔

"مسلمان ہو؟"

"نہیں!!"

"سکھ ہو، عیسائی ہو، ہندو ہو، کیا ہو؟"

"کچھ بھی نہیں — میرا کوئی مذہب نہیں"

اس موقعے پہ عدالت کا جج مداخلت کرتا ہے اور کہتا ہے:

"اگر تمھارا نام عبدالرحمٰن ہے، تو تم مسلمان ہو!!"

جج کی رولنگ پر ملزم اور وکیل خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد سرکاری وکیل ملزم سے اس کی عمر کے بارے میں سوال کرتا ہے، تو وہ غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہتا ہے:

"یہ بھی جج صاحب سے پوچھ لو۔ جب وہ میرے مذہب کے بارے میں جانتا ہے تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ میں کب پیدا ہوا تھا۔"

جالندھر ٹی وی سے دکھایا جانے والا بچوں کا ایک ڈرامہ تاریخ اسلام کے ایک درخشندہ چہرے پر سیاہی ملنے کی گھناؤنی کوشش تھی۔ اس میں محمود غزنوی کے بارے میں کیا گیا زہریلا پروپیگنڈا استعارے کی زبان میں مسلم قوم سے اظہار نفرت تھا۔ ایک ماں اپنے سات آٹھ سالہ بچے کو سلانے کے لیے کچھ گنگنا رہی ہے۔ اس گیت کے بارے میں ماں بیٹے میں یوں مکالمہ ہوتا ہے:

بیٹا : ماں! یہ تم کیا گا رہی ہو؟

ماں : بیٹا یہ وہ گیت ہے جو میری ماں سلاتے وقت مجھے سنایا کرتی تھی۔

بیٹا : مجھے بھی سکھاؤ، جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو اپنے بچوں کو گا کر سلایا کروں گا۔

ماں : میرے بچے! یہ خوف کا گیت ہے، تم اسے نہ سیکھو۔

بیٹا : نہیں ماں مجھے سکھاؤ۔ میں ضرور سیکھوں گا۔ (بچہ ضد کرتا ہے)

ماں : یہ پرانے وقتوں کا گیت ہے۔ مائیں بچوں کو ڈراتی تھیں اس کے ساتھ۔ یہ گیت اس طرح ہے:

بیٹا جی نا جانا دُور دُور — نہ جانا دُور دُور
تُرک نشے میں چُور چُور — ترک نشے میں چُور

بیٹا : ماں یہ ترک کیا ہوتا ہے؟

ماں : بیٹا بہت پرانے سمے کی بات ہے۔ ایک ترک تھا۔ نام تھا اس کا محمود غزنوی وہ بہت ظالم تھا۔ طاقت کے نشے میں چور رہتا تھا۔ وہ چور بھی تھا۔ وہ ہمارے ملک میں آتا اور ہمارے بھگوان کی مورتیاں توڑ کر سونا چرا کر لے جاتا تھا۔

بیٹا : (اپنے نیفے میں اڑسا ہوا خنجر کھینچتے ہوئے) میں نہیں ڈرتا کسی ترک سے۔ میں اُسے مار ڈالوں گا۔

اس پر ماں رونے لگتی ہے۔ بیٹا پریشان ہو کر اس سے لپٹ جاتا ہے اور کہتا ہے:
"نہ رو ماں۔ میں تم سے گیت نہیں پوچھوں گا۔ مت رو"؟

ماں : بیٹا! میں تو اس لیے رو رہی ہوں کہ مجھے تمہارا سورگباشی پتا یاد آگیا۔ وہ بھی تمہاری طرح بہادر تھا۔ وہ بھی ترک سے نہیں ڈرتا تھا اور ہر وقت اپنے پاس خنجر رکھتا تھا۔

بھارتی مسلمان آج اس خنجر کی زد میں ہیں۔ انہیں غزنویؒ اور عالمگیرؒ کے "جرائم" کی سزا مل رہی ہے۔ ہندو اکثریت ہر وقت اپنی آستینوں میں خنجر چھپائے رکھتی ہے۔ دوستی بری چیز نہیں بشرطیکہ یک طرفہ نہ ہو۔ ہمارے ارباب اختیار ہندو ثقافت و تہذیب کے غلبے کی سازش سے بھی ہوشیار رہیں۔

بحث و نظر

جماعتِ اسلامی اور سیاساتِ پاکستان

۱۔ جناب جاوید انصاری صاحب مدیر معاون یونیورسل میسیج۔ کراچی

۲۔ جناب فتحی عثمان چیف ایڈیٹر عریبیا۔ لندن۔

۳۔ مدیر ترجمان القرآن۔

ماہنامہ عریبیا کے تازہ شمارے (ماہ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۵ء) میں جناب جاوید انصاری نے جماعت اسلامی کی ایک حامیانہ تصویر پیش کی ہے۔ اس پر جناب فتحی عثمان چیف ایڈیٹر عریبیا نے بطور خاص تبصرہ کیا ہے۔ جماعت کو انقلابیت سے ہٹ کر "دعوۃ" کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس سلسلے میں مدیر ترجمان القرآن نے بھی محسوس کیا کہ کچھ کہنا ضروری ہے۔ مجھے اپنی رائے مرتب کر کے مرتب کر کے براہ راست "عریبیا" کو بھجوانی ہے، مگر اس وقت اس کا ترجمان القرآن میں آنا ضروری ہے۔

میری سہولت کے لیے جناب پروفیسر آسی ضیائی رام پوری اور برادر عزیز عبدالہادی احمد دونوں نے متذکرہ مضامین کے اُردو تراجم فراہم کر دیے تاکہ رسالے کی تیاری میں تاخیر نہ ہو۔ اُمید ہے کہ یہ تحریریں قارئین کے لیے دلچسپ ہی نہیں، بہت مفید بھی ہوں گی۔

(خ۔ م)

(۱)

جناب جاوید انصاری مدیر معاون "میسیج" کراچی

گذشتہ برسوں میں جماعتِ اسلامی پاکستان، تنقید و تذلیل کی کئی مہموں کا موضوع رہی ہے۔

اِس مضمون کا مقصد ان نکتہ چینیوں کا جائزہ لینا اور ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء تک کے کٹھن دَور میں جماعت کی پالیسیوں کا معقول اور متوازن دفاع کرنا ہے۔

مسٹر بھٹو نے جس جمہوریت کو چلتا کر دیا تھا اُس کی بحالی کے لیے تحریک میں جماعت پیش پیش تھی۔ مگر اس تحریک میں شامل چند بے صبر عناصر جلد ہی الگ ہو گئے اور فوج کو پاکستان کی قومی سیاسی زندگی پر قبضہ مستحکم کر لینے دیا گیا۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک کے عرصے میں تحریک میں شامل جماعتوں نے بالعموم فوج سے مفاہمانہ رویّہ اختیار کیے رکھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ نئی فوجی انتظامیہ نے وہ خطیبانہ سیاسی نعرہ اپنایا جو بہت دلکش تھا۔ جنرل ضیاء نے پاکستان میں اسلامی سیاسی نظام قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ اُنھوں نے علامتی اصلاحات اور معاشی پالیسیاں نافذ کیں، جن کا مثبت اثر ہوا، اور اُنھوں نے جلد ہی نمائندہ حکومت بحال کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

اگست ۱۹۷۸ء میں جو سول انتظامیہ قائم کی گئی اس میں دو مقاصد کے پیشِ نظر جماعت بھی شامل ہو گئی: اوّلاً وہ اس طریق پر حاوی ہو جانا چاہتی تھی جو پارلیمانی جمہوریت کی بحالی پر منتج ہو۔ ثانیاً وہ ایسی قومی پالیسی اور اصلاحات بروئے کار لانا چاہتی تھی جو پاکستان میں اسلامی نظامِ معاشرت تعمیر کرنے کی راہ ہموار کر سکیں۔ ۹ ماہ کا وہ عرصہ جب جماعت حکومت میں شامل تھی، نہایت مایوس کن ثابت ہوا۔ ہم میں سے جو صاحبان وزارتوں میں آئے وہ جنرل ضیاء اور اس کے فوجی حلیفوں کے اصل عزائم سے باخبر ہو گئے۔ یہ واضح ہو گیا کہ فوجی حکومت معاشرے کو اسلامی بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اُس کا تو مقصد اسلام کو اُسی طرح استعمال کرنا تھا جیسے بھٹو سوشلزم کو اور فیلڈ مارشل ایوب خان قومیت کو استعمال کر رہے تھے۔ یوں اسلامی بنانا محض معاشرے کو سیاست سے الگ رکھنے اور فوجی آمریت کو دوام بخشنے کا ایک ذریعہ تھا۔ جماعت کی وزارتوں نے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۷۹ء تک کے عرصے میں جو پالیسیاں تجویز کیں اُن کی بڑی اکثریت کو صدر اور اُس کے مشیروں نے مسترد کر دیا۔

۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۵ء تک جماعت فوجی انتظامیہ کی پالیسیوں کی کڑی مخالف رہی۔ ان پالیسیوں میں کھلے تضادات سے جماعت کی قیادت کو تشویش تھی تاہم بعض رفقاء کی دلیل یہ تھی کہ صدر خود تو ایک مخلص مسلمان ہے مگر سول انتظامیہ اس کی پالیسیوں کو ناکام بنائے دے رہی ہے۔ اس طرح ضرورت تھی کہ جس اسلامی فکر کی نمائندگی کا صدر کو دعویٰ تھا اُس کی تائید کی جائے اور ان پالیسیوں کے نفاذ کے لیے ایسے ادارے اور

طریقے وضع کیے جائیں جو نوکر شاہی کو قابو میں رکھیں۔

ارکانِ جماعت کی بھاری اکثریت نے اس حکمتِ عملی کی توثیق کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر ضیاء کو اس سال قومی استصواب میں جماعت کی حمایت حاصل رہی۔ اس استصواب سے حکومت کے "اسلامیانے" کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی توثیق مطلوب تھی۔ مگر استصواب سے کچھ ہی قبل جنرل ضیاء نے ایک ٹیلی وژن نشریے میں کہا کہ اس توثیق کا مطلب وہ یہ لیں گے کہ انہیں مزید پانچ سال تک پاکستان کے صدر بنے رہنے کا پروانہ مل گیا۔ جماعت جنرل ضیاء کی حمایت پر رضامند ہو گئی، کیونکہ امیر جماعت میاں طفیل محمد سے ایک ملاقات میں صدر نے وعدہ کیا کہ وہ شریعت کو ملک کا بالادست قانون بنائیں گے، ۱۹۷۳ء کا دستور تمام و کمال بحال کر دیں گے اور غیر مشروط طور پر مارشل لا اٹھا لیں گے۔

جماعت کے جو رہنما ۱۹۷۸ء تا ۱۹۷۹ء سول انتظامیہ میں وزیر رہ چکے تھے انھیں صدر کی وعدہ خلافی پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ وہ چھ سال پہلے ہی جان گئے تھے کہ فوجی قیادت، افسر شاہی کے اختیارات گھٹانے یا عوامی نمائندگی کے لیے اسباب پیدا کرنے کا، جس سے افسروں کو قابو میں رکھا جا سکے، کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ ان رہنماؤں کا کہنا تھا کہ جماعت حکومت کی نافذ کردہ "نفاذِ اسلام کی اسکیم" کا پول کھول دے اور عوام کو بتا دیا جائے کہ یہ محض پاکستان پر فوجی آمریت جاری رکھنے کا ایک پردہ ہے۔

وسط ۱۹۸۵ء میں جماعت نے فیصلہ کیا کہ قومی اور تمام صوبائی اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرے، نیز اس نے اس کے لیے بھی مساعی تیز کر دیں کہ ایک وسیع بنیاد سیاسی پروگرام پر مبنی قومی اتحاد قائم کرے۔ اس پروگرام کے کلیدی عناصر یہ ہیں:

— ۱۹۷۳ء کے دستور کی تمام و کمال بحالی اور پاکستان میں اسلامی جمہوریت کا قیام۔

— پاکستان کی قومی سالمیت کا تحفظ اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے عطا کردہ چھوٹے صوبوں کے حقوق کی بحالی۔

— جہادِ افغانستان کی حمایت جاری رکھنا۔

جماعت کو فوجی حکومت سے تعاون پر بھی ہدفِ نکتہ چینی بنایا گیا ہے اور اس کی مخالفت کے لیے ایک قومی سیاسی اتحاد قائم کرنے کی کوشش پر بھی۔ میرا یہ منشا نہیں کہ ان میں سے کسی حکمتِ عملی کا دفاع کروں۔ میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلامی اقدار اور اسلامی نظریۂ سیاسی کے تناظر میں یہ دونوں حکمتیں بالکل جائز ہیں۔ کسی ایک سیاسی تدبیر کا انتخاب سیاسی طور پر مہنگا، بلکہ شاید بہت ہی مہنگا

پڑ سکتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ بطور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے ، جماعت اسلامی کے لیے یہ جائز نہیں۔

ایک اسلامی انقلابی پارٹی ہونے ہوئے جماعت سے وقتاً فوقتاً سیاسی غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں جماعت نے اپنے ارکان اور کارکنوں کی اخلاقی و روحانی تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ کچھ کارکنوں میں دنیا کی طرف میلان پیدا ہو چلا ہے اور اسلامی کام سے اُن کا رویّہ پیشہ ورانہ سا بن گیا ہے۔ اس کا نتیجہ پارٹی ڈسپلن ڈھیلا پڑ جانے اور پاکستانی معاشرے پر جماعت کے کام کا اخلاقی اثر ہلکا ہو جانے کی صورت میں رُونما ہوا ہے۔

تحریک میں جو فوائد حاصل ہوئے تھے ، جماعت انہیں اختیار کرنے - INSTITUTION - ALISING میں کامیاب نہ ہو سکی۔ مزید برآں ، انتخابی سیاست پر زیادہ توجہ دینے کے باعث سماجی اور تعلیمی کام ، جو جماعت نے اپنے نقشے رکھے تھے ، اُن کی طرف سے بھی بے اعتنائی برتی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کے شہروں اور قصبوں میں عوامی بنیاد قائم کر لینے کے بہت سے مواقع جماعت نے کھو دیے۔ سب سے بڑھ کر یہ امر نقصان دہ ہوا کہ انقلابی نظریے کے فروغ کی طرف ناکافی توجہ دی گئی۔ بہت سے پالیسی اقدامات بیرونی محرکات کے فوری (ADHOC) تقاضوں کے تحت عمل میں آئے۔

جماعت کو شدید خطرے کا سامنا ہے کہ اس کی نگاہوں سے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے عمل کا مربوط منظر اوجھل نہ ہو جائے اور وہ اس عمل کو دوسروں کے سامنے آشکارا کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے کوتاہ ثابت ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر عملیت اور تجربیت ہی پارٹی کے بنیادی اُصول بن کر رہ جائیں گے۔

جماعت کو جو ناکامیاں ہوئیں اُن کی وجہ سے کتنے ہی رفقاء کو مایوسی ہوئی اور کچھ جماعت سے نکل بھی گئے ، مگر انہیں پاکستان کی لادینی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل کوئی اور پلیٹ فارم تیار کرنے میں ناکامی ہوئی ، بلکہ اکثر نے تو یہ کوشش ہی نہیں کی۔ جماعت اسلامی ہی ملک میں وہ تنہا سیاسی اور سماجی قوت ہے جو پاکستان میں ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے پائیدار تحریک چلانے کی اہل ہے۔ یہ اس لیے کہ مولانا مودودیؒ کا پیش کردہ انقلابی نظریہ قطعی درست ہے اور آج کی مسلم دنیا میں نظریاتی اور

سماجی حالات میں انتہائی موزوں بیٹھتا ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل کے قضیوں میں سمیٹا جاسکتا ہے۔

— نوآبادیاتی استعمار کے تحت مسلم معاشروں میں باقاعدہ طبقہ بندی (FUNCTIONAL DISJUNCTURE) نمایاں ہے جو حکمران گروہ کی سماجی علیحدگی پسندی میں نظر آتا ہے، اور یہ طبقہ اصلاً بیرونی استعمار کی حمایت کے بل پر سیاسی اقتدار پر قابض ہے۔

— ان معاشروں کے اسلامی کردار کی بحالی کا تقاضا ہے کہ ان زبردستی کے سیاسی دھر ماتماؤں کو بے دخل اور منتشر کر دیا جائے اور منظم مسلم طاقتوں کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار مستحکم کر دیا جائے۔

— مسلم ممالک میں اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کا واحد پائیدار آلہ ایک اسلامی انقلابی جماعت ہی ہوسکتی ہے۔ ایسی پارٹیاں اپنے سماجی اثرات کو سیاسی اقتدار میں بدل دینے ہی سے غرض رکھیں نہ کہ جزوی اصلاحات سے۔

یہ امر کہ جماعتِ اسلامی ایک اسلامی انقلابی پارٹی ہے، دو باتوں سے ظاہر ہے۔ قیام پاکستان ہی سے یہ جماعت پاکستانی سیاست میں فعال رہی ہے۔ وہ جزوی اصلاحات پر کبھی مطمئن نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنی تمام سرگرمیاں پاکستان میں اسلامی اصولِ سیاست و مدنیت کی تعمیر کے بنیادی کام میں صرف کرتی رہی ہے — ۱۹۴۸ء میں، ۱۹۶۲ء میں، ۱۹۷۱ء میں اور ۱۹۷۷ء میں پاکستان کا اسلامی تشخص منوانے اور جمہوریت بحال کرانے والی تمام قومی تحریکوں میں مرکزی کردار جماعت ہی کا رہا ہے۔ ۱۹۸۲ء سے ایم۔ آر۔ ڈی کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان میں بحالی جمہوریت کی کوئی قومی تحریک، جماعت کی فعال شرکت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ آج جماعتِ اسلامی ہی پاکستان کی وہ واحد قومی جماعت ہے جو ایسی کوئی قومی تحریک منظم کرسکتی ہے جو عزم و فداکاری کی عملی طاقت بھی رکھتی ہے اور ایسی قیادت بھی جو ملک کے قومی اور اسلامی مفادات کو ذاتی مفاد پر فوقیت دینے کی اہل ہے۔

قربانیاں دینے کی اعلیٰ صلاحیت رکھنا جماعت کی قیادت کا ہمیشہ سے نمایاں وصف رہا ہے۔ قیادت کے اندر پالیسی کے مسائل پر اختلافات نے جماعت کو ہمیشہ تقویت ہی بخشی ہے۔ گذشتہ سالوں میں میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور کے مابین پالیسی تناظروں میں اختلافات پر بہت سے ہمدردوں کو تشویش ہوئی بعض مخالفین نے اس پر خوش ہو کر جماعت کی یقینی شکست و ریخت کی پیش گوئیاں بھی کیں۔ مگر جماعت کے اندران میں سے کسی رہنما نے بھی مایوسی ظاہر نہ کی۔ میاں طفیل محمد ایک نہایت محبوب امیر ہیں۔ جنہوں نے

ارکان کے لیے بلند اخلاق کا نمونہ قائم کیا ہے اور پروفیسر غفور کی سیاسی بصیرت کا بھی وسیع احترام کیا جاتا ہے۔ اور جماعت کا سیاسی کردار دوبالا کرنے میں اُن کا کام نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جماعت ہمیشہ جمہوری تنظیم پر کام کرتی آئی ہے۔ اور جب تک انفرادی قربانیاں اور اللہ کی رضا کے لیے کام کرتے رہنے کا عزم باقی رہے گا۔ سیاسی مناظروں میں اختلافات جماعت کی تقویت ہی کا باعث بنتے رہیں گے۔ یہ اختلافات جماعت کی اندرونی زندگی میں جمہوری کردار کے مظہر ہیں۔ ان سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ جماعتی قیادت اختلافی سیاسی پسند و ناپسند سے باخبر ہے اور اپنی قومی حکمتِ عملی میں لچک کا عنصر شامل کر لینے کی اہل بھی ہے۔

پاکستان کے علمبردارانِ اسلام کو جماعت کے قریب تر آنا چاہیے۔ پاکستان کی قومی سالمیت برقرار رکھنے اور اس کا اسلامی کردار منوانے کے لیے یہ ایک اہم قوت کی نمائندگی کرتی ہے۔ ماضی میں اس نے سیاسی غلطیاں بھی کی ہوں گی۔ مگر بطور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے، یہ تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ماحول کے تغیرات سے ہم آہنگ ہوجانے کی اہلیت کا ثبوت بھی دے چکی ہے۔ پاکستان کو اسلامی انقلابی خطوط پر چلا کر بدل ڈالنے کا اس کے سوا اور کوئی سیاسی ادارہ موجود نہیں ہے۔ جماعت پاکستان کا مستقبل بنانے میں اہم کردار ادا کیا چاہتی ہے۔ پاکستان کے اسلامی انقلابیوں کا، جو اس جماعت کی حمایت کرکے اور اس کی قیادت کے گرد جمع ہو کر بے یار و مددگار رہ جانے سے بچ سکتے ہیں، یہی قدرتی ملجا و ماویٰ ہے۔ (ترجمہ: پروفیسر آسی ضیائی، رام پوری)

---

(۲)

جناب فتحی عثمان چیف ایڈیٹر عریبیا، لندن

جہاں میں اپنی اس تحریر کی یاد تازہ کر رہا ہوں جو میں نے ڈاکٹر جاوید کے خط (عریبیا جون ۱۹۸۵ء) پر لکھی تھی۔ میں اب بھی اس یقین پر قائم ہوں کہ مسلم انقلابی (REVOLUTIONARY ISLAMIST) یا اسلامی انقلابی (ISLAMIC REVOLUTIONARY) کی اصطلاح ان لوگوں کو نہیں سجتی جو اسلام کے پیغام کو جامعیت اور اس کی امتیازی شان کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کا دار و مدار پیغامِ الٰہی کی حیثیت سے دعوت پر ہے اور اس کے مخاطب تمام لوگ ہیں: ظالم بھی اور مظلوم بھی۔

وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو روشن اور بہر روز دلائل اور مؤثر کردار کے ذریعے خدا کی طرف موڑنا چاہتا ہے:

"اے نبیؐ اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو" (النحل ۱۲۵)

یہاں تک کہ خدا کے رسول موسیٰ اور ہارون علیہما السلام جو ایک جابر حکمران فرعون کی طرف بھیجے گئے، انہیں بھی ہدایت کی گئی کہ وہ اسے خدا کا پیغام جس قدر ممکن ہو قابل قبول طریقے سے پہنچائیں۔

"جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے" (طٰہٰ - ۴۴-۴۳)

ایمان والوں کو تو اپنا اور اپنے عقیدے کا دفاع کرنا ہی ہے جبکہ اربابِ اقتدار بھی ہمیشہ ان کو دبانے اور ان کے پیغام کو خاموش کرنے کے لئے قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تصادم کی پالیسی سے اسلام کے حق میں بہتر نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ کسی بھی گروہ کو اس وقت تک دشمن تصور کرنا درست نہیں ہوتا جب تک دشمنی ایک ٹھوس حقیقت نہ بن جائے۔ مختلف گروہوں کے متضاد مفادات کا حل بنیادی طور پہ ایک خدا پر یقین رکھنے میں ہے۔ اس نوع کے باہمی تنازعات کو حل کرنے کے لئے خدائی تعلیمات و قوانین کی مکمل اطاعت ضروری ہے۔ اگر کوئی صاحبِ ثروت شخص آسائش زندگی کے میسر سامان اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تو اسے محض اس بات پہ اسلام کا انکار کرنے والا تصور نہیں کر لینا چاہیئے، کیونکہ خدائی پیغام کے اوصاف اور بنی آدم کو خدا کے عطا کردہ روحانی اور علم و دانش پر مبنی کمالات بسا اوقات انقلاب آفرین اور بنیادی تبدیلی کے سبب بن جاتے ہیں۔ دعوت کی حکمتِ عملی میں اہلِ ایمان کو جمع کرنا اور منظم کرنا زیادہ اہم اور فائق ہے۔

"اور اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں اور نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت

پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔" (حٰم السجدہ ۳۵-۳۴)

"اے نبی، برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔" (المومنون - ۹۶)

یہ عین ممکن ہے کہ اسلامی تحریک کے کچھ لوگ معاشرے کی اساسی تبدیلی کا اسلامی تعلیمات پر مبنی تصور مؤثر، واضح، قابل عمل اور موزوں انداز میں پیش کرنے سے قاصر رہیں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس انقلاب کی وہ ترغیب دلاتے اور تبلیغ کرتے ہوں وہ بانجھ اور بنجر نکلے، اس اندازِ فکر و عمل کی بناء پر عوام اس کے فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ اسلام کے لئے، جو تمام بنی نوع انسان کے لئے خدا کا پیغام ہے "مستقل انقلاب" کا نعرہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اسلامی تحریک کے لئے موزوں تر لفظ "مستقل دعوت" ہے۔ وہ جو معاشرے کی اساسی تبدیلی کے اسلامی پیغام کو پیش کرتی اور اس کی اشاعت کرتی ہے۔ اس کی تشکیل متعدد عوامل سے ہوتی ہے۔ عقل اور اخلاق، انصاف اور امن کی تمام جہتوں میں ـــــ روحانی اور مادی، سماجی اور سیاسی، داخلی اور بین الاقوامی ہر شعبے میں۔

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔" (آل عمران - ۱۰۴)

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پہ ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا (آل عمران - ۱۱۰)

کسی بھی نوع کی نزاعی صورتحال میں عقلی استدلال اور پرامن حل کو ترجیح حاصل ہونی چاہیئے قوت کا استعمال صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب دلیل آزمالی گئی ہو اور ناکام ہو چکی ہو

اور کوئی مخالف قوت مسلسل جارحیت پر تلی ہو۔

" اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

(الحجرات - ۱۰ - ۹)

اب جماعت اسلامی چاہے تو ڈاکٹر جاوید کی اپنے بارے میں " ایک انقلابی جماعت" ہونے کی رائے کو قبول کرے یا رد کر دے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مولانا مودودی نے اپنی اردو تحریروں میں جو لفظ " انقلاب" استعمال کیا ہے اور جو عربی تراجم میں بھی موجود ہے، معاشرے میں اساسی تغیر پیدا کرنے والے اسباب کی طرف نہیں بلکہ خود اس " بنیادی تغیر" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پیغامِ الٰہی کی حیثیت سے اسلام کا یہ وصف ہے کہ یہ مطلوبہ تبدیلی کو انسان کی باطنی آمادگی (CONVICTION) پر تعمیر کرتا ہے اور یہ طاقتور اور کمزور کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے اس لئے کہ یہ ہر بنی آدم کے دل و دماغ کو مخاطب کرتا ہے۔ معاشرے میں بنیادی تغیر، ایسے تغیر کی دعوت دینے والی تحریک، میں جمہور کی شرکت اور ان کی مادی اور اخلاقی ضروریات کی تکمیل کو صرف انقلابی کے " لیبل" تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔

ہر اسلامی تحریک کو ان مقاصد تک پہنچنے کے لئے ایسا منصوبہ بنانا چاہیئے جس میں موجودہ ماحول اور زمان و مکان کے عملی تقاضوں کا خیال رکھا جائے۔ یہ اہتمام بھی کر لیا جائے کہ یہ اسلامی تعلیمات کی رہنمائی میں ہو۔ مارکسی نقطۂ نظر سے جو چیز انقلابی معیار کے طور پر متعارف کی جاتی ہے ممکن ہے اسے عملیت (PRAGMATISM) تجربیت (EMPIRICISM) یا اصلاح کاری (REFORMISM) کہہ کر مسترد کر دیا جائے لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ لازماً کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں ہے۔ مفکرین اسلام کی یہ نہایت سنجیدہ ذمہ داری ہے کہ وہ سماجی تبدیلی کے سلسلے

میں اسلامی تحریک کو رہنمائی فراہم کریں، نہ کہ یہ میدان مارکسی نظریے کی اجارہ داری کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ فکری خلفشار سے حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے۔

تاہم جماعت اسلامی معاصر اسلامی تحریک کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ "عربیا" ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس سے تحریک اور فکر کے میدانوں میں مختلف اسلامی مکاتیبِ فکر کو اظہارِ خیال کا موقع مہیا کیا جا سکتا ہے۔ اگر جماعت اسلامی اس سلسلے میں اپنا مؤقف بیان کرنا ضروری سمجھے تو ان معاہدت کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

---

(۳)

مدیر ترجمان القرآن، لاہور

میں دل سے جناب عادل انصاری اور جناب فتحی عثمان کا شکر گزار ہوں کہ دونوں حضرات نے جماعتِ اسلامی کے متعلق جو کچھ کہنا ضروری سمجھا، نیک نیتی اور خیر خواہی سے کہا۔ اسی بنا پر میرے اندر کوئی تنقیدی ردِ عمل پیدا نہیں ہوا بلکہ استفادہ کا جذبہ غالب رہا۔ رہے کچھ اختلافی پہلو تو وہ لکھنے یا سوچنے والوں میں کہاں نہیں ہوتے۔

جناب فتحی عثمان کا وہ شاندار مقالہ بھی میرے سامنے ہے جو "قیادت و خدماتِ مودودیؒ" کے عنوان سے عربیا دسمبر ۱۹۸۴ء (ربیع الاوّل ۱۴۰۵ھ) میں شائع ہوا۔ میں ان کی صلاحیتوں ہی کا نہیں، ان کی محنت و کاوش کا بھی معترف ہوں۔

دونوں حضرات کی تحریروں (عربیا دسمبر ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۶ھ) کے متعلق بعض نکات بطورِ وضاحت عرض کرتا ہوں:

۱۔ جماعتِ اسلامی پاکستان گزشتہ چند برسوں میں جہاں کچھ حلقوں کی طرف سے تنقید و تحقیر کا نشانہ بنائی گئی، وہاں ملک کے سنجیدہ مزاج خواص اور نیک نہاد عوام نے اُسے اس لحاظ سے تحسین کی نگاہ سے دیکھا کہ دین اور ملک کو خطرات سے بچانے اور بحالیٔ جمہوریت کے لیے فضا کو سازگار بنانے کے لیے اُس نے نہایت درجہ محتاط اور متوازن پالیسی اختیار کی اور تصادم کے محرکات کے موجود ہونے کے باوجود تخریبی عناصر کا چند قدم بھی ساتھ نہیں دیا۔ جو لوگ اسے تصادم کی راہ پر گھسیٹ لے جانا

چاہئے تھے انہی نے زچ ہو کر اسے مارشل لا کی بی ٹیم قرار دیا اور یہ بات بار بار چھاپی، مگر جماعت طنز و تعریض کی اس بوچھاڑ کے باوجود اپنے سوچے سمجھے موقف پر مضبوطی سے قائم رہی۔ آج بحالی جمہوریت کی راہ میں اڑنگا لگانے والے عناصر پٹ گئے ہیں اور دعوت حق کے لیے کام کرنے کے راستے کھل رہے ہیں۔

۳۔ جماعت کے لیے حکومت میں شمولیت کی تین ماہیاں اس لحاظ سے مایوس کن ثابت ہوئیں کہ جس مقدار و معیار کا کام کرنا مطلوب تھا وہ نہ ہو سکا۔ مگر دوسری طرف بہت سے دائروں میں بھی تبدیلیاں خاص اس دور میں تیزی سے شروع ہوئیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قدر نقش۔

۴۔ مارشل لا یا جنرل ضیاء کے متعلق جماعت سے جن دو اختلافی آرا اور ان کے دو گروہوں کو انصاری صاحب نے منسوب کیا ہے۔ ان کی کوئی جماعتی اہمیت مجلس شوریٰ کا دستوری فیصلہ ہو جانے کے بعد نہیں رہتی۔ ہمارے ہاں کوئی ایسی مسلمہ روایت نہیں ہے کہ کسی اہم مبحث کے متعلق جماعتی فیصلے سے پہلے یا بعد میں اس کے افراد جماعت کے متعین کردہ دستوری دائرے سے باہر اپنی متفرقانہ آرا کو الگ الگ کر کے پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعے پھیلائیں۔ اگر ایسی کوئی لغزش کسی سے صادر ہو بھی جائے تو وہ لغزش جماعت کی خوبیوں یا خرابیوں میں محسوب نہیں ہو سکتی۔

۴۔ صدر کی جس وعدہ خلافی کا ذکر انصاری صاحب نے کیا، اس کے خلاف بالاختصاص سابق وزرا ہی کا نہیں، مرکزی قیادت سے لے کر عام کارکنان تک کسی نہ کسی رنگ کا ردعمل موجود تھا۔ مگر جماعت کے مجموعی ذہن نے اس تکلیف دہ پوائنٹ پر "حکومت کے نفاذِ اسلام کی اسکیم کا پول کھول دینے" کی کسی بڑی مہم میں لگ جانے کے بجائے زیادہ بہتر یہ سمجھا کہ بھرپور کوشش اس بات کے لیے ہونی چاہیے کہ فوجی آمریت کی تلوار سروں سے ہٹے اور جمہوری راستے کھلیں۔ اور ملک کے ہنگامہ پسند اور تخریبی عناصر کے پلڑے میں اپنی اجتماعی روش کا وزن ڈال کر ایسے حالات پیدا نہ کر دیے جائیں کہ مارشل لا طول کھینچے یا وہ فقط اپنا چہرہ تبدیل کر کے رہ جائے۔

البتہ فوجی آمریت کے منصوبۂ نفاذِ اسلام اور اس کے محرکات اور طریقِ نفاذ پر نہ صرف مجلسِ شوریٰ کی قراردادوں میں، اور امیر جماعت کے بیانوں اور مخطوط بنام صدر میں بلکہ ترجمان القرآن کے اوراق میں بھی تمام حقائق لگی لپٹی رکھے بغیر واشگاف طور سے بیان ہوتے رہے ہیں۔

۵ ۔ محض "ہدفِ نکتہ چینی" بننا کسی اسلامی نظامِ جماعت کے فیصلہ و عمل کے عدمِ صحت کی دلیل نہیں ہے۔ حکومت کی جن معاملات میں جہاں تک ہم نے تائید کی (اس کے ساتھ ہمارے شدید قسم کے تنقیدی بیانات اور قراردادوں کو سامنے رکھنا چاہیے) اور پھر دوسری جانب اتحاد قائم کرنے کے لیے جو نقشہ ہم نے بنایا، یہ دونوں باتیں ہماری دیانت دارانہ سوچ پر مبنی تھیں۔ یہ تو قاعدہ ہے کہ جب بھی کوئی جماعت سیاست میں رواجِ عام سے ہٹ کر کوئی موقف اختیار کرتی ہے تو اس پر نکتہ چینیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔

۶ ۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک کے فوائد کو سمیٹ سنبھال کر ساتھ لینا اور انہیں سرمایہ کار بنا لینا اس لیے ممکن نہ ہوا کہ قومی اتحاد کے ٹوٹنے کے علاوہ خود جماعتیں کالعدم قرار پا گئیں اور ہمارے پاس وہ ٹھوس تنظیمی مشینری باقی نہ رہی جس کے ذریعے تحریک ۱۹۷۷ء کی فراہم کردہ قوت کو استعمال میں لایا جاتا۔

۷ ۔ انتخابی سیاست پر توجہ دینے کا زمانہ مارشل لاء کے تحت تو بہت ہی مختصر تھا۔ سماجی تعلیمی اور تربیتی کام (جنہیں جماعت نے اپنے ٹوٹے پھوٹے نظام کے بعد بھی یکسر ختم نہیں ہونے دیا) اور اس کے اثرات میں جو کمی آئی، شہروں اور قصبوں میں عوامی بنیاد قائم کرنے کے مواقع ہمارے اہداف کے مطابق وسیع نہ ہو سکے (یہ اندازہ صحیح نہیں ہے کہ یہ مواقع یکسر کھو دیئے گئے) نیز انقلابی نظریے کی دعوت کو حدِ مطلوب تک پھیلانے میں جو کوتاہی ہوئی، ان چیزوں کا بڑا سبب بھی جماعت کی کالعدمیت تھا۔ فکری انتشار کا ماحول، طرح طرح کے ٹکراتے ہوئے رجحانات کے جھگڑوں کا چھڑنا، مختلف سطحوں اور علاقوں کے کارکنوں کی تعدادِ کثیر کا نت بدلتے بے ہنگم حالات میں ہم آہنگ نہ رہ سکنا، سیاسی لیڈروں کی متفرق بولیاں، مذہبی اکابر کی فکری نیرنگیاں، واعظوں کی شعلہ بیانیاں اور اخباروں کا متضاد قسم کے صد گونہ "سچ" بہت زیادہ بولنا، ان حالات میں اگر خیالات میں الجھاؤ پیدا ہوں اور عمل میں کہیں تذبذب اور کہیں جمود، اور اخلاق میں زوال، تو کیا عجب۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ جماعت میں اس طرح کا انتشار و انحطاط کچھ زیادہ واقع نہیں ہوا۔ اور بحالیٔ جماعت کے بعد کمزوریوں پر بہت جلد قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر خدانخواستہ ہم بحالیٔ نظم کے بعد اپنی اصلاح و تعمیر کا کام نہ کر سکے تو پھر کیا کرایا خراب ہو جائے گا۔

۸ ۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ اپنے اصول و مقاصد کو درکنار رکھ کر ہم نے محض بیرونی محرکات کے فوری

تقاضوں کے تحت پالیسیوں کی تشکیل کی ہو۔ وہ ایک بار خارجی احوال نے ہم سے ذرا جلد جواب مانگا۔ ویسے کون سا زندہ فرد یا زندہ گروہ ہے جو خارجی احوال وظروف سے قطع نظر کر کے انقلاب یا اصلاح کے راستے پر چلے۔ ہر حال میں ہم نے اپنے نصب العین اور اصولوں کو اپنے سامنے رکھا۔

۹ — میرا خیال ہے کہ ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ ہمارے لوگ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے جامع عمل سے غافل ہو جائیں یا اسے دوسروں کے سامنے واضح کرنے میں کوتاہ ثابت ہوں۔ اصولی طور پر تبدیلی کے تفصیلی اہداف ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں۔ اور اس لٹریچر میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف عملاً ہم تعمیر معاشرہ کی مساعی سے گزرتے ہوئے اور امکانات اور مزاحمتوں کو سمجھتے ہوئے حال اور مستقبل کی پوری تصویر پیش نظر رکھتے ہیں۔ عملیت (IMPIRICISM) اور تجربیت (PRAGMATISM) کی اصطلاحات کے پیرائے میں آپ نے جس اندیشہ پر توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ کہیں ہم اپنے سفینۂ تحریک کو اصول ومقاصد کے پتوار اور بادبان سے فارغ کر کے ہوائے وقت کے حوالے نہ کر دیں۔ مطمئن رہیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا۔ انشاءاللہ۔

۱۰ — آخر میں میاں طفیل محمد صاحب اور محترم پروفیسر غفور احمد صاحب کے اختلافات کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اختلافات تو اتفاقاً اور غیر متوقع طور پر سامنے آ گئے، ورنہ پالیسی طے کرتے ہوئے مجلس شوریٰ میں جو بحثیں ہوتی ہیں، اگر کہیں وہ ساری سامنے آ جایا کریں تو میرا خیال ہے کہ ہر صبح اور ہر شام اپنے بیگانے انتظار کریں کہ جماعت کی شکست وریخت ابھی ہونے والی ہے۔ پروفیسر غفور احمد صاحب کے علاوہ بھی بہت سے اختلاف کرنے والے دل کھول کر اظہار رائے کرتے ہیں۔ کسر صرف یہ ہے کہ ان کی بحثیں اور آرا ایوان سے باہر نہیں آتیں۔

۱۱ — متذکرہ مثال کو سامنے رکھ کر آپ نے بطور تحسین فرمایا ہے کہ یہ اختلافات جماعت کی اندرونی زندگی میں جمہوری کردار کے مظہر ہیں۔ بلاشبہ مقررہ سطح پر اور مقررہ دائرے میں ہمارا جمہوری کردار بڑے سے بڑے اختلافات کو گوارا کرتا ہے، مگر ہمارا دستور اس کی اجازت نہیں دیتا کہ درون ایوان کی بحثیں اور اختلافی آرا کو باہر لے جایا جائے۔ یہ جماعت کے جمہوری کردار سے تجاوز ہے اور ہماری کمزوری ہے۔ آپ کی تحسین کے شاید پوری طرح ہم مستحق نہ ہوں۔

۱۲ — میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ "مسلم انقلابی" یا "اسلامی انقلابی" کی اصطلاح دین کو جامعیت

اور انبیا ذی شان کے ساتھ پیش کرنے والوں کو کیوں نہیں سجتی؟ اگر معاملہ محض ذوق کا ہو تو مقامِ بحث نہیں۔ اور اگر بات استدلال کی ہو تو قطعی دلائل سامنے آنے چاہئیں۔ دلائل صرف آیات ہی سے نہ ملیں گے بلکہ اُن کی ایسی تعبیر و تشریح سے ملیں گے جو اقامتِ دین کی جمیع سرگرمیوں پر راست آسکے۔

دین کا اولین تقاضا اور دائمی مطالبہ "دعوت" ہی کا ہے۔ لیکن "دعوت بمعنی وعظ" اور "دعوت بمعنی پیغامِ انقلاب" میں فرق ہے۔ مولینا مودودیؒ نے "رسالہ تجدید و احیائے دین"، "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے"، "اسلام کا نظریہ سیاسی"، "دعوتِ اسلامی کے تین نکات"، "سیاسی کشمکش حصہ سوم"، "خلافت و ملوکیت"، "جماعتِ اسلامی کا لائحہ عمل" وغیرہ میں اپنی دعوت کو انقلابی دعوت کے طور پر پیش کیا۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ مسئلہ صرف انفرادی اصلاح کا نہیں ہے بلکہ افراد کو منظم ہو کر اجتماعی اصلاح و تغیر کے لیے سعی و جہاد کرنی ہے اور تباہ کن سیلاب کا مقابلہ جوابی سیلاب اٹھا کر کرنا ہے۔

انقلاب کا مفہوم لازمی طور پر انتہا پسندانہ تبدیلی (RADICAL CHANGE) نہیں ہے۔ بلکہ انقلابی تبدیلی کے معنی جو ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں (بخوفِ طوالت یہاں اقتباسات اور حوالے نہیں دئے جا سکتا) - وہ یہ ہیں کہ تبدیلی بنیادی قسم کی مطلوب ہے اور جامع اور ہمہ گیر قسم کی مطلوب ہے۔ فرد کے قلب و ضمیر سے آغاز پا کر ایوانِ حکومت اور معاشرے کے ہر شعبے تک اسلام کو قائم ہو جانا چاہیے۔ نقطۂ آغاز فرد ہی رہے گا۔ اور بنیادی وسیلہ کار دعوت ہی ہو گا۔

دعوت کے تصور کو وہ کتاب واضح کرتی ہے جس کا نام ہے "دعوتِ اسلامی کے تین نکات" اور تین نکات اجمالاً یہ ہیں:-

I --- اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی اختیار کرو۔

II --- دو رنگی اور منافقت چھوڑ دو اور اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیاں جمع نہ کرو۔

III --- خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو دنیا کی رہنمائی اور فرمانروائی کے منصب سے ہٹا دو تاکہ زندگی کی گاڑی ٹھیک ٹھیک اللہ کی بندگی کے راستے پر چل سکے۔

لٹریچر کے دوسرے اہم حصوں کو سامنے رکھ کر ذیل کے چوتھے نکتے کا اضافہ کیا جا سکتا ہے:

IV --- تمام گروہ بندیوں، فرقوں اور پارٹیوں کی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر اقامتِ دین کا

کام کرنے والے نظامِ جماعت میں اپنی قوتوں کو مجتمع کرو اور پھر اپنی منظم طاقت سے دعوت کو بھی پھیلاؤ۔ امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر بھی کرو اور کفر بالطاغوت کا فریضہ بھی ادا کرو۔ تا آنکہ اس جہادِ مسلسل کے نتیجے میں پورے کا پورا دین قائم و نافذ ہو جائے۔

۳۔ میرا خیال ہے کہ آج کل شاید بعض اصحاب اسلامی انقلاب کی اصطلاح سے اس لیے بھی بچنا چاہتے ہیں کہ ایران کے اسلامی انقلاب سے اپنے کام کی نوعیت کو ممیز رکھا جائے اور امریکہ و یورپ میں "جارحانہ اسلامیت" کا جو خوف پھیلایا گیا ہے اس کا ازالہ کرنے کے لیے انقلاب کے لفظ کو چھوڑ دیا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ بار بار لٹریچرِ دعوت کی وضاحت میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کو بدلنا نہیں چاہیے، البتہ ان کا صحیح مفہوم واضح رکھنا چاہیے۔ مولانا مودودیؒ نے بخوبی تشریح کر دی تھی کہ ہماری مراد مار دھاڑ کا انقلاب نہیں ہے، بلکہ دعوتی، تعلیمی، پُرامن اور آئینی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اصل نقطۂ آغاز بھی دعوت ہے اور دعوت ہی کو آخر دم تک تمام دوسری سرگرمیوں کے ساتھ جاری رہنا ہے۔ البتہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بالکل آخری مرحلے کی ایک جست تحریک کس انداز سے لگائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہزار ایک شکلیں ہو سکتی ہیں۔

۴۔ یہ درست ہے کہ اسلام کی دعوت کے مخاطب ظالم و مظلوم سب ہیں اور وہ دلوں اور دماغوں کو روشن دلائل اور مؤثر کردار کے ساتھ خدا اور اس کے دین کی طرف موڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن عملاً تاریخ میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ مظلوم اور غریب اور کمزور عناصر جلد اور کثیر تعداد میں لبیک کہتے ہیں جب کہ ظالم افراد اور طبقے مزاحمت کرتے ہیں اور ان کی اکثریت اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے دعوتِ حق کو ملیامیٹ کر دینا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لبیک کہنے والوں، مزاحمت کرنے والوں اور دشمنی پر اتر آنے والوں کے لیے دعوتی رویے الگ الگ ہوتے جاتے ہیں۔

اساسی طور پر دعوتِ اسلامی کی روح اخلاص اور نرم خوئی ہی رہے گی۔ مگر احوال اور مخاطبین کی روش کی وجہ سے اندازِ دعوت میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ و ہارون کو فرعون کے سامنے "قولِ لین" کہنے کی ہدایت دی گئی تھی تو ساتھ ڈرا دینے والی نو ۹ نشانیاں بھی دی گئی تھیں۔ نیز انہوں نے خدا پرستانہ اساسی دعوت کے ساتھ یہ سیاسی مطالبہ بھی صاف صاف طور پر کر دیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کا حق دو۔ اس سے الگ ایک انداز حضرت ابراہیمؑ کا بھی تھا،

جنہوں نے بتوں کا مسئلہ بھی کیا اور اس سلسلے میں بت پرستوں کے سوالات کے جواب طنزیہ دیے، نیز نمرود سرکش کے سامنے چیلنج کے انداز کی بات کی۔ "حکمت" کا مدعا یہی ہے کہ موقع بہ موقع دعوت کے مؤثر انداز اختیار کیے جائیں۔ نوبت "جاھد الکفار والمشرکین واغلظ علیھم" تک پہنچی ہے۔

۱۵- یہ تصور کہ ایمان والوں کو محض اپنے عقیدے کا دفاع کرنا ہوتا ہے، حقیقت کا کوئی جامع نقشہ پیش نہیں کرتا۔ دعوت ایسے پُرزور استدلال اور اخلاقی وزن کے ساتھ دی جاسکتی ہے کہ مخالفین اپنے نظریات کو جارحانہ طور پر آگے بڑھانے کے بجائے ان کا دفاع کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ تصادم سے بچنے کی ہزار کوشش کیجیے، کسی بھی نئی دعوت کا اٹھنا پہلے فکری، پھر سماجی اور آخر میں سیاسی تصادم پیدا کر دیتا ہے، خصوصاً جب کہ "لا" کے پردے میں کفر بالطاغوت دعوت کے بنیادی کلمے میں شامل ہو۔ عموماً تصادم کا آغاز مخالف قوتوں کی طرف سے جھوٹ، بے جا الزام تراشی اور تشدد کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس طرح دعوتِ حق کے علم بردار مظلومی کے مقام پر آجاتے ہیں اور مظلومی ایسی قوت ہے جو ظلم کی تلوار کو توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ داعیِ حق فرد یا جماعت یا تحریک کو ظالم بن کر نہیں، بلکہ مظلومی کی راہ سے کام کرنا ہے۔

۱۶- مسئلہ محض کسی شخص کے آسائشیں رکھنے کا اہم نہیں ہے، بلکہ ایک تو اس کو نوازنے والے نظامِ تقسیمِ دولت کو دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کہاں تک عادلانہ ہے اور دوسرے یہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ آسائشیں رکھنے والے لوگوں ہی کی اکثریت یا تو مزاحم بنتی ہے، یا اختلاف کرتی ہے، یا بے عملی کا شکار رہتی ہے۔ نیز ایک ایک شخص کی آسائشیں کتنے ہی دوسرے بے شمار انسانوں اور ان کے بچوں کے لیے وجہِ اذیت اور باعثِ اضطراب بنتی ہیں۔ لہٰذا دعوتِ حق فقط آسائشیں رکھنے کی بنیاد پر کسی شخص کی مخالفت نہیں کرتی مگر یہ بھی مسئلہ ہے کہ خدا کی راہ میں صاحبِ دعوت یا داعیِ انقلاب بننے کے ساتھ دنیوی لذات اور آسائشوں کی کثرت چل نہیں سکتی۔ یا تو دعوت کے لیے انفاق کے بڑھنے کے ساتھ لذات اور آسائشیں گھٹیں گی یا پھر خود دعوت کمزور ہونا شروع ہو جائے گی — اسلام کا کام کرنے کے لیے ایک گونہ فقر کا ہونا ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ دولت کے ہوتے ہوئے بھی فقر غالب ہو سکتا ہے مگر ایسا مرتبہ پانے والے کم ہی دیکھنے میں آئیں گے۔

۱۷۔ جس طرح یہ ممکن ہے کہ اسلامی تحریک کے لوگ معاشرے کی اساسی تبدیلی کا اسلامی تعلیمات پر مبنی تصور موزوں انداز میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح یہ بھی بہت زیادہ ممکن ہے کہ خالص دعوتِ اسلامی کو پیش کرنے والے بھی اس کے صحیح مفہوم اور تقاضوں اور وسعتوں کے ساتھ اور اُس کی مطلوبہ تبدیلیوں اور اس سے پیدا ہونے والے اُصولی اور فکری تصادموں کے ساتھ سامنے نہ لا سکیں۔ نتیجہ اس کا یہی ہوگا کہ دعوتِ اسلامی سے وہ انسان مطلوب اور اس کے رویّے وجود ہی نہ آ سکیں گے جن کا طلب گار دین ہے۔ تارک الدنیا درویش، خانقاہی صوفی اور انفرادی مسلمانیت کے نمونے اسی وجہ سے وجود میں آتے رہے۔ انقلابی دعوت اگر نتائج کے لحاظ سے بانجھ اور بنجر نکل سکتی ہے تو خالی دعوت بھی اس معنی میں بانجھ پن دکھا سکتی ہے کہ سینکڑوں نیک آدمیوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی بدی کا تختہ اُن کے کاندھوں پر لٹکا رہے اور ظلم و خیانت کا طوفان چاروں طرف موجزن رہے۔

۱۸۔ "بُرائیوں سے روکنے" کا جو حوالہ آپ نے آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ سے دیا ہے، اس کے متعلق کیا یہ فرمائیں گے کہ روکنے سے کیا کیا شکلیں مراد ہیں، نیز کیا اس کی کسی ادنیٰ شکل پر سالہا سال کے لیے قانع ہو کر بیٹھ رہنا اس جذبے میں زندگی باقی رہنے دے گا۔ دُنیا میں جب بھی کسی مروّج چیز کو روکنے کا کام شروع کیا جاتا ہے، معاشرے میں تدوبستر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر دعوت کا واعظانہ تصور ختم ہو جاتا ہے۔

۱۹۔ ایک قوت ہے فوجی قوت، اس کا استعمال تو بہت ہی خاص قسم کے حالات کے لیے مخصوص ہے۔ دوسری قوت رائے عام کی سیاسی قوت ہوتی ہے۔ آپ کسی بھی حکومت میں رہتے ہوئے اس قوت سے کام لے کر مخالف کو زچ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے معاشروں میں لادینیت اور سیکولرازم کا طوفان جارحانہ انداز سے آگے بڑھ رہا ہے، عیاشی و فحاشی کا ریلا ہے، شریعت میں ترامیم کی جا رہی ہیں۔ دینی اصطلاحات کو بدلا جا رہا ہے۔ پردے کو غارت کیا جا رہا ہے۔ کیا اس حالت میں یہ بات "دعوت" کے خلاف ہوگی کہ اخبارات اور اسٹیج کے ذریعے اس طوفان کے خلاف آواز اُٹھائی جائے، جلسے کیے جائیں، ممکن ہو تو پُرامن خاموش مظاہرے کیے جائیں، ارکانِ پارلیمان سے وفود کے وفود ملیں، محضرنامے بھجوائے جائیں۔ مجھے کوئی اُلجھن نظر نہیں آتی

۲۰ ـــ باطنی آمادگی (CONVICTION) ضروری ہے۔ مگر اس آمادگی کے حصول کے بعد اگر ایک شخص یا گروہ اپنی قوتوں کو اسلامی انقلاب انگیزی کی مہم میں لگا ئے تو کونسا گناہ اس سے سرزد ہوا "لیبل" کا مسئلہ وہاں ہوتا ہے جہاں حقیقت تو کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کرتا ہو۔ ہم تو فی الحقیقت تصور اسلام کے ساتھ انقلابیت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیبل ازم کا ایسا ہی اطلاق غیر انقلابی دعوت پر بھی ہو سکتا ہے۔

۲۱ ـــ عملیت اور تجربیت اور اصلاح کاری کی جو اصطلاحات جناب انصاری و جناب فتحی نے استعمال کی ہیں ان کی جبلت مادہ پرستانہ ہے۔ یہ اصطلاحات ایک جامع فلسفے کے معروف سوچ ہیں ان کا جوڑ اسلام سے لگانا مناسب نہیں۔ ہماری اپنی اصطلاحات ہیں اور ہمیں انہی میں بات کرنی چاہیئے۔

۲۲ ـــ یہ بڑی قابل قدر بات ہے کہ برادر مکرم فتحی عثمان صاحب نے عربیبیا کے صفحات کو مختلف اسلامی مکاتب فکر کے لیے مشترک پلیٹ فارم قرار دے کر یہ دعوت دی ہے کہ جماعت اسلامی کی طرف سے بھی احباب چاہیں تو خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورت استدلال کے لیے آیات واحادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات واحادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

رسائل و مسائل

بدری صحابیوں کی مغفرت اور قنوتِ نازلہ

سوال: سوال یہ ہے کہ جنگ تبوک سے جو تین صحابہ پیچھے رہ گئے تھے اُن میں دو بدری بھی تھے۔ جن کے متعلق قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کی سند بھی دے دی تھی اور تینوں سچے اور پختہ مسلمان تھے۔ نیت میں بھی کوئی کھوٹ معلوم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی چیز نظر آتی ہے تو وہ ذرا سی سستی۔ پھر باوجود اتنے کمالات کے انہیں اتنی سخت سزا کیوں دی گئی اور پورے پچاس دن کے بعد اُن کی توبہ قبول ہوئی۔ حالانکہ بدر میں شامل ہونے والوں کو سب کچھ معاف کر دیا گیا تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آج مسلمان دنیائے کفار کے حملوں سے دو نوں طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور حدیث شریف میں آتا ہے اگر مسلمان اس قسم کے خطرات میں گھر جائیں تو دعائے قنوت نازلہ اپنی نمازوں میں پڑھا کریں۔ ۱۹۶۵ء میں جب ہندوستان نے حملہ کیا تھا تو مجھے یاد ہے کہ سرحد اکوڑہ خٹک کے دارالعلوم جامع کے صدر بادشاہ گل صاحب مرحوم نے پورے صوبے کا دورہ اسی خاطر کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت زندہ کی جائے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ تمام امام صاحبان نے یہ دعا پڑھنی شروع کر دی تھی اور بادشاہ گل صاحب صرف اس ایک سنت کے زندہ کرنے پر زور دے رہے تھے۔

مگر اب ان حالات سے زیادہ افغانستان اور پاکستان کفار کی زد میں ہیں مگر یہ آواز کسی ادارہ سے نہیں آرہی ہے، حالانکہ بڑے بڑے لاکھوں کی تعداد میں مسلمانوں کے اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ چیز کہیں نہیں ملتی۔

جواب :- اہلِ بدر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لعل اللہ اطلع علی اہل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم[1] "شاید اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کا حال معلوم کر لیا ہے اور فرما دیا ہے کہ تم جو چاہو کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے"۔ کا یہ مطلب نہیں کہ اہلِ بدر احکام شرعیہ کے مکلف نہیں رہے یا اُن سے کسی کوتاہی پہ دُنیوی مواخذہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اُن سے کوئی کوتاہی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کا سامان کر دے گا اور انہیں ایسے کام کی توفیق عنایت فرما دے گا کہ اس کی بنا پر اُن کی اُخروی سزا معاف ہو جائے۔ جن بزرگ صحابہؓ کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے اگر آپ ان کے واقعہ میں غور و فکر کرتے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ انتہائی کٹھن موقعہ پر انہیں سچ بولنے اور منافقین کی طرح جھوٹے اعذار پیش کرنے سے اجتناب کی توفیق غزوہ بدر میں شرکت کی بدولت ہی نصیب ہوئی اور انہوں نے وہ استقامت دکھلائی کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے پڑھی جانے والی کتاب میں اُن کا ذکر خیر...... نازل فرما دیا۔

آپ کا یہ کہنا کہ اُن کی کوتاہی معمولی تھی اُس وقت درست ہوتا جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی کوتاہی کو غیر معمولی قرار نہ دیا ہوتا۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کوتاہی کو غیر معمولی قرار دے کر ان کا بائیکاٹ کیا تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض ایک چھوٹی سی کوتاہی تھی۔

آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل قنوت نازلہ کبھی نہیں پڑھی، بلکہ ایک موقع پر زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ تک اُسے پڑھا۔ پھر دوسرے موقع پہ دوبارہ پڑھا۔ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں" والصواب هو القول الثالث الذى عليه جمهور اهل الحديث وكثير من ائمة اهل الحجاز وهو الذى فى الصحيحين وغيرهما انه صلى الله عليه وسلم

---

[1] اہل بدر جس تربیت اور جن امتحانات اور جس آخری شدید مرحلۂ آزمائش سے خلوص نیت اور کردار درخشاں کے ساتھ گذرے وہ اس بات کی شہادت ہیں کہ اُن کے دلوں میں جان بوجھ کر گناہ کرنے کی قوت کام نہیں کر سکے گی۔ لیکن اللہ نے گناہ معاف کر دیئے۔ ظاہری قانون اور نظم کے خلاف جس کسی سے بھی کوئی غلط کاری ثابت ہو جائے خواہ وہ گواہی سے ہو، اعترافِ قصور سے ہو، اس پہ قانونی اور سماجی کارروائی تو بہر حال ہوگی (س ن ج)

قنت شهرا يدعوا على رعل وذكوان وعصية ثم ترك هذا القنوت ثم انه بعد ذالك بمدة بعد خيبر وبعد اسلام ابي هريرة قنت۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں "واما انه كان يدعوا فى الفجر دائما قبل الركوع او بعده بدعاء يسمع منه او لا يسمع فهذا باطل قطعاً"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک رعل ذکوان اور عصیۃ کے خلاف قنوت نازلہ پڑھا پھر اس کو چھوڑ دیا۔ پھر ایک مدت کے بعد غزوہ خیبر اور ابی ہریرہ کے اسلام لانے کے بعد قنوت پڑھا۔ یہ کہنا کہ آپ نے فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھا، اونچا یا آہستہ، رکوع سے پہلے یا بعد، تو یہ قطعاً باطل ہے"۔ البتہ یہ بات ٹھیک ہے کہ موقع بموقع، وقفے وقفے سے اسے پڑھنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ یہ پہلو بھی مدنظر رکھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عملاً جہاد اور فتح کے اسباب پر عمل کرتے کے ساتھ قنوتِ نازلہ پڑھتے تھے اس لیے اصل قنوتِ نازلہ کے پڑھنے کا حق افغان مجاہدین کو ہے یا پھر ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے کوششیں کرتے ہیں ایسے لوگوں کی قنوتِ نازلہ جو نہ لادینیت کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور نہ افغان مجاہدین سے تعاون کرتے ہیں اسکے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ کے ہاں اُن کی قنوتِ نازلہ کا کیا مقام ہے۔ یہ بات آپ کے علم میں لانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افغان مجاہدین قنوتِ نازلہ پڑھتے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"والذى عليه اهل المعرفة بالحديث انه قنت لسبب وتركه لزوال السبب" (فتاویٰ جلد ۲۲ ص ۳۷۲)

"آپ نے ایک سبب کی بنا پر اسے شروع کیا اور اس سبب کے ختم ہونے پر اسے چھوڑ دیا۔"

مطبوعات

قرآن وحدیث کا ادبی رُخ | از جناب محمد محسن ٹونکی ۔ ناشر: پبلک لائبریری ایسوسی ایشن، سی ۸/ ۱۵۹، ملیر کالونی، کراچی ۱۹ ۔ جناب لطیف شکور ایڈووکیٹ کی طرف سے مفت تقسیم کرائی گئی ۔ ملنے کا پتہ: ۱۵۵ استی بلڈنگ پہلی منزل حسرت موہانی روڈ آف آئی آئی چندریگر روڈ ۔ کراچی ۔

قرآن (بعد ازاں حدیث) کی ادبی قدر و قیمت پر اُردو زبان میں بہت کم کلام کیا گیا ۔ پہلی بار محمد محسن ٹونکی صاحب کی یہ کتاب سامنے آئی ہے اور بڑا دلآویز سامانِ مطالعہ ساتھ لائی ہے ۔ روشن حقیقت ہے کہ قرآن ایک کلامِ دلنشیں ہے ۔ وہ سارا ایک ادبی شاہکار (بلکہ معجزہ) ہے ۔ پھر اس کی خاص خاص عبارتیں زلزلہ افگن بھی ہیں اور کہیں گہربار اور گلبار بھی ۔ قرآن اپنے پڑھنے والے کو پہلے ہلکے انداز سے متاثر کرتا ہے پھر اسے جھنجھوڑ دیتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا معیارِ ادب و بلاغت کتنا بلند ہوگا ۔ محمد محسن صاحب نے تعارف الکنایات، قرآنِ کریم اور بلاغت، استعارۂ تمثیلیہ، استعارات بالکنایہ، ایجازِ حذف اور مجازِ مرسل وغیرہ موضوعات کے تحت قرآنی کلام کے نمونے توضیحات کے ساتھ پیش کیے ہیں ۔ خاص طور پر "پانی" سے متعلق قرآنی بیان کی مختلف مثالوں کو تفصیل سے لیا ہے ۔ اسی طرح سورۂ فیل اور سورۂ لہب کی ادبی خوبیوں پر جامع گفتگو فرمائی ہے ۔ ساتھ ساتھ اور بالخصوص آخر میں احادیثِ پاک کے حسنِ ادبیت کو بھی نمایاں کیا ہے ۔ ضمناً ہر بحث میں کتنی ہی عام یا سائنسی معلومات جمع کر کے مؤلف نے کتاب کو زیادہ قابلِ قدر بنا دیا ہے ۔ مؤلف عربی ادب کے صنائع و بدائع کا شعور رکھتے ہیں ۔

میری رائے یہ ہے کہ اسی اچھے و قیمتی کام کی صورت میں جو قدم آغاز اٹھایا گیا ہے، کچھ لوگوں کو اس سے آگے مزید کام کرنا چاہیے ۔

سیرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا از جناب سیرت نگار صحابہؓ طالب ہاشمی صاحب - ناشر: البدر پبلی کیشنز -
۲۳، راحت مارکیٹ، اُردو بازار لاہور، قیمت: -/۳۰ روپے -

طالب ہاشمی صاحب کو ان کا قلم ان شاء اللہ جنت میں لے جائے گا - انہوں نے صحابہ و صحابیات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور صلحائے اُمت کی سیرتوں کے جو عکس پیش کیے ہیں، اُن کے ذریعے نہ صرف اُردو زبان و ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے بلکہ دینِ قیم کی تجلیات کو خوب نمایاں کیا ہے ۔ نیز عترتِ رسولؐ کی شان پیش فرمائی ہے - سبحان اللہ! کتاب پڑھیں تو معلوم ہو گا کہ حضرت فاطمہؓ کی سیرت، محبتِ والد، رقتِ مشقت، صبر، ذکر و عبادت، انفاق و اطعام، ہمدردی، طاعتِ شوہر، شفقت و تربیتِ اولاد اور عفت و حیا کی گلدستہ عبارت سے بنی تھی - عالمِ طفلی ہی میں ایک موقع پر اچھے کپڑے اور زیور پہننے سے انکار کر دیا (ص ۶۳) ذہانت کا یہ عالم کہ جب بچی تھیں تو والدہ سے سوال کیا کہ کیا اللہ ہمیں نظر بھی آ سکتا ہے؟ (ص ۶۲) غیرت ایسی کہ کم عمری میں ابوجہل کے تھپڑ مارنے کا بدلہ لے لیا (ص ۶۶) - رات کو بخار ہوتا اور صبح کو چکی پیستیں، پانی کا مشکیزہ بھر کر لاتیں، پھر بھی پوری عبادت کرتیں اور اولاد کی گواہی ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے آرام اور فائدے کے لیے دُعا نہیں کی - (ص   ) سونے کا ہار حضورؐ کے اشارے سے اُتارا اور بیچ دیا (ص ۱۳۵) - اسی طرح پردہ اور کنگنوں کا معاملہ ہوا (ص ۱۳۶) - حضرت اسماءؓ کے سامنے یہ وصیت کی کہ میرا جنازہ لے جاتے وقت اور تدفین کے وقت پردے کا پورا لحاظ رکھنا - (ص ۱۷۳) - کچھ لوگوں نے تاریخ کے تمام ریکارڈ پر خط پھیر کر یہ دعویٰ کیا کہ حضورؐ کی ایک ہی بیٹی فاطمہؓ تھیں - طالب ہاشمی صاحب نے وضاحت سے بتایا ہے کہ چار صاحبزادیاں تھیں اور سب کے حالات لکھے ہیں -

ایک گروہ نے میراثِ رسولؐ (باغِ فدک وغیرہ) کی بحث چھیڑ کر خلیفہ اوّل اور حضرت فاطمہؓ و جملہ لواحقین کے درمیان کشیدگی و اختلاف کا سماں پیدا کر دکھایا ہے - مگر حضورؐ اور حضورؐ کے اہلِ خاندان کی شدید محبت عوام میں تھی - اور ایسے میں اگر خلیفۂ اوّل سے ناچاقی ہوتی تو چہ میگوئیوں کا طوفان انقلاب ملا دجزر پیدا کر دیتا - بات صرف یہ ہے کہ خلیفۂ اوّل نے اس معاملے میں بھی اپنا   اصولی مسلک برقرار رکھا کہ حضورؐ نے جس طرح کسی معاملے کو چلایا میں اس میں رد و بدل نہیں کر سکتا - اگر رنجش تھی بھی تو ثابت ہے کہ وہ افہام و تفہیم سے دفع ہو گئی - ملاحظہ ہوں روایاتِ طبقات ابن سعد، البدایہ والنہایہ، مسندِ احمد بن حنبل اور شرح نہج البلاغہ - جلد ۵ (ص ۱۷۰ - ۱۶۹) - حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی پیدائش بعثت سے

ایک سال پہلے اور وفات ۲/ رمضان المبارک ۱۱ھ (بروایت اہل تشیع ۳/ جمادی الآخری ۱۱ھ) ہوئی
۔ ایک مبارک ہستی کے متعلق مبارک کتاب ہے۔ کاش کہ آج کی عورت یہ سمجھ سکے کہ اس کی ذہنی،
معاشرتی اور اخلاقی قیادت کا نمونہ وہ ہے جو اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔

افغان مجاہدین | از جناب اسعد گیلانی ایم اے، ایم این اے، ناشر: اسلامی اکادمی منصورہ لاہور
قیمت: ۵۰/- روپے۔

مسئلہ افغانستان ــــ روسی جارحیت، جہاد افغانستان اور مہاجرین افغانستان کے متعلق اردو میں جتنا زیادہ لٹریچر نمودار ہو جانا چاہیے تھا، اتنا نہیں ہوا۔ ایک طرف اہل علم و فضل کا فرض تھا کہ وہ افغانستان کی تاریخ، قوم افاغنہ کی روایات، افغانستان میں روس کی دوستانہ مداخلت اور اس میں روز بروز اضافہ، کمیونزم کا سیاسی لیڈروں اور گروہوں اور نوجوان حلقوں میں نفوذ، محل میں اس کا غلبہ وغیرہ، مسائل پر نہایت درجہ تحقیقی لٹریچر لکھا جاتا۔ دوسری طرف ادیبوں اور شاعروں کا کام تھا کہ وہ جارحیت کے خلاف اور اپنی آزادی کا تحفظ کرنے والے نہتے افغانوں کے حق میں لفظ کے محاذ سے اخلاقی مدد صداقت و انصاف کو پہنچاتے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ قوم کا خاصا بڑا حصہ بے حس ہے اور اس وقت کا منتظر ہے جب بے حسی کی برفانی چٹانوں کو مشیت کا قانون اپنے نیزے سے پھاڑ دے۔

صرف چند کتابیں اور رسائل ہمارے پاس ہیں۔ ان میں ایک یہ کتاب " افغان مجاہدین" نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔ اسعد گیلانی صاحب نے اس کتاب میں دونوں طرح سے کام کیا ہے۔ یعنی ایک گونہ تاریخ و تحقیق کا بھی اور بیشتر ادبیت کے پیرائے میں۔ تقریظ میں انہوں نے مسئلے کا پورا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ اگلی فصل کا عنوان ہی پوری داستان ہے: " روس دوست خود سامراج"۔ پھر ہجرت اور جہاد کے عنوانات پر دل کھول کر گیلانی صاحب نے پُر زور اظہار کیا ہے۔ ہجرت و جہاد دونوں ان کے بہت ہی خاص موضوع ہیں۔ وہ ہمیں جنگ کے معرکوں کے درمیان لے جاتے ہیں، وہ مہاجروں کے قافلوں کے ساتھ شامل کر دیتے ہیں، مہاجرین کے کیمپ میں لے جا کر ایسے ایسے زندہ کرداروں سے متعارف کراتے اور ان کی سرگذشتیں سنواتے ہیں کہ دل ہل جاتا ہے۔

سب سے زیادہ جھنجھوڑ دینے والا باب وہ ہے جس میں افغان مجاہد عالمِ اسلام کو پکارتا ہے اور عالمِ اسلام ہی جواب دیتا ہے۔ یہ جواب میرے ہی اشعار پر مشتمل ہے جسے کچھ عرصہ پہلے میں نے کسی اور پیرائے میں لکھا تھا۔

البدر از: سلیم منصور خالد۔ ناشر: ادارہ مطبوعاتِ طلبہ۔ لاہور ۱۶۔ قیمت: ۳۰/- روپے

البدر محب اسلام نوجوانوں کا وہ گروہ تھا جنہوں نے ہر قسم کے مفاد اور خوف سے بے نیاز ہو کر پاکستان کے مشرقی حصے میں بھارتی فوجیوں، گھس بیٹھیوں، مکتی باہنی اور مجیب باہنی کے خلاف جانبازی و سرفروشی کا کھیل کھیلا۔ ان کا مقصد تھا کہ وہ سازش ناکام ہو جائے جو پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے مشرقی حصے کو ہدف بنائے ہوئے تھی۔ ہزاروں نوجوان خاک و خون میں لوٹ گئے۔ اس سازش کا ٹینک اُن کے اوپر سے اور اُن کی سرزمین کے اوپر سے تباہی مچاتا اس لیے گزر گیا کہ اس سازش میں حصہ خود پاکستان کے سرپرستوں اور خادموں کا بھی تھا۔

البدر کے نوجوان سرفروشوں کی یہ داستان بڑی مفصل ہے اور اس کا ریکارڈ بڑی محنت سے جمع کیا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جب اسلامی روح بیدار ہو جاتی ہے تو آج بھی لوگوں سے شجاعت کے ویسے ہی فوارے اُبلنے لگتے ہیں جیسے صدیوں پہلے اُبلے تھے اور بار بار اُبلتے رہے۔ دوسری بات یہ کہ البدر کے قربانی دینے والے ہزاروں نوجوانوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں نکلا کہ جس نے مخالف طاقت کی سنگینوں کی زد میں آ کر یا بازو و ٹانگیں کٹ جانے پر بھی ان کا مطلوبہ مخالفِ پاکستان نعرہ لگایا ہو۔ یا جان بچانے کے لیے کوئی ذرا سی کمزوری دکھائی ہو۔ تیسری یہ کہ اسلامی رُوح بیدار ہو جائے تو آج بھی قلیل التعداد گروہ قلیل ہتھیاروں کے ساتھ زیادہ بڑے مسلح جتھوں کو جھکا سکتے ہیں۔ چوتھا سبق یہ ہے کہ پاکستان کی محبت کے زبانی کلامی دعوے کرنے کے مقابلے میں اپنے خون سے لوحِ خاک پر نقوشِ وفا مرتسم کر دینا ایسا ثبوتِ محبت ہے کہ کسی دعوے کے بغیر ہی دشمن تک تسلیم کر لیتا ہے۔ پانچواں راز یہ کہ بعض مراحل میں بظاہر بازی ہاتھ سے نکل جاتی ہے، لیکن بعد میں وہی شکست فتوحات کے راستے کھول دیتی ہے۔ کاش کہ لوگ یہ سبق اخذ کر سکیں۔

سلیم منصور خالد نے کتنے ہی معرکوں کا منظر ہمارے سامنے لا رکھا ہے اور کیسے کیسے شاندار

کرداروں سے دورانِ نقل و حرکت ہماری ملاقات کرادی ہے۔

پاکستان بلکہ عالمِ اسلام کے تمام نوجوانوں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

المسبار (اشاعتِ خاص) مرتبہ: ڈاکٹر ظہور احمد اظہر مدیر اعزازی و مجلسِ مشیران۔ دفتر اشاعت: فرینڈز آف دی مسلم ورلڈ، ڈنگہ سنگھ بلڈنگ، شاہراہ قائداعظم لاہور۔ چندہ سالانہ: ۵۰/۔ روپے۔ ٹائیٹل رنگین دبیز آرٹ پیپر۔

محبانِ عالمِ اسلامی کی طرف سے بیک وقت عربی اور انگریزی میں شائع ہونے والا یہ سہ ماہی جریدہ اپنی عمر کی بہت سی بہاریں دیکھ چکا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے جلد ۱۵ کا شمارہ ۳، ۴ ہے جو مسئلہ افغانستان پر خصوصی اشاعت ہے۔ مجلسِ مشیران میں ایس انوار الحق سابق چیف جسٹس پاکستان، مولانا حامد علی خان، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید شامل ہیں۔ اس اشاعتِ خاص کے تمام مضامین قیمتی ہیں۔ مثلاً سوویٹ مسلمانوں پر ماسکو کی جارحیت، سوویٹ یونین میں مسلمانوں کی گوریلا جنگ (۱۹۲۰ء—۸۱ء)، افغانستان کے نئے اسباق، افغانستان میں سوویٹ یونین کے ۵ سال، مسئلہ افغانستان میں پاکستان کیا کیا راہیں اختیار کر سکتا ہے، افغانستان کی اسلامی تحریک اور جارحیت کی مزاحمت میں اس کا حصہ۔ لکھنے والے بھی مرتبہ و مقام رکھتے ہیں۔

قادیانی نبی اور غازی منجم تالیف: غازی منجم صدر پاکستان نجوم سوسائٹی، پرنسپل غازی نجوم کالج۔

پتہ: ۷۵/۴ بنک روڈ۔ صدر، راولپنڈی۔

غازی منجم پاکستانی اخبارات کے ذریعے پہلے سے خوب متعارف ہیں۔ وہ ایک نظر انسانوں پر ڈالتے ہیں، ایک ستاروں پر اور پھر جو دل میں آتی ہے لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے لکھا: "جو شخص، جماعت یا ملک پاکستان کی مخالفت یا نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے عتاب سے نہیں بچ سکے گا" ہزار علمِ نجوم ایک طرف اور یہ پُرجوش جملہ ایک طرف۔ ان کا ستاروں کو دیکھنے اور نتائج نکالنے کا انداز بالکل اپنا ہے بلکہ یکسر پاکستانی ہے۔

اس کتاب کا اصل دلچسپ غالب حصہ وہ ہے جس میں مرزائیوں یا قادیانیوں کو غازی صاحب نے اپنے علمِ نجوم کی زد میں لے کر ان کا خاکہ ایسے اُڑایا ہے کہ دن میں تارے دکھا دیے ہیں۔ اس سلسلے کے خطوط کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔